سہ ماہی

علمی و تحقیقی مجلّہ

# نورِ معرفت

30

☆ اداریہ
☆ انسانی تربیت کی ضرورت
☆ امام جعفر صادقؑ کی جانشینی
☆ تصورِ مذہب کے مختلف نظریے
☆ قرآن وسنت میں وحدت کا مقام
☆ حضرت زیدؑ شہید کے قیام کے اسباب
☆ ذرائع ابلاغ کا آغاز وارتقا اور عصری اہمیت
☆ امام علیؑ کی نگاہ میں وحدت کی ضرورت اور اہمیت
☆ گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے اسباب پر اجمالی نظر
☆ قیامِ حضرت امام حسینؑ میں اہل کوفہ کے خطوط کا کردار

# اتفاق و یکجہتی کے اثرات

وقَالَ عَلَيْهِ السَّلامُ :وَ احْذَرُوا مَا نَزَلَ بِالْأُمَمِ قَبْلَكُمْ مِنَ الْمَثُلَاتِ بِسُوءِ الْأَفْعَالِ وَ ذَمِيمِ الْأَعْمَالِ فَتَذَكَّرُوا فِي الْخَيْرِ وَ الشَّرِّ أَحْوَالَهُمْ وَ احْذَرُوا أَنْ تَكُونُوا أَمْثَالَهُمْ فَإِذَا تَفَكَّرْتُمْ فِي تَفَاوُتِ حَالِهِمْ فَالْزَمُوا كُلَّ أَمْرٍ لَزِمَتِ الْعِزَّةُ بِهِ شَأْنَهُمْ وَ زَاحَتِ الْأَعْدَاءُ لَهُ عَنْهُمْ وَ مُدَّتِ الْعَافِيَةُ بِهِ عَلَيْهِمْ وَ انْقَادَتِ النِّعْمَةُ لَهُ مَعَهُمْ وَ وَصَلَتِ الْكَرَامَةُ عَلَيْهِ حَبْلَهُمْ مِنَ الِاجْتِنَابِ لِلْفُرْقَةِ وَ اللُّزُومِ لِلْأُلْفَةِ وَ التَّحَاضِّ عَلَيْهَا وَ التَّوَاصِي بِهَا.

یعنی: امام علی علیہ السلام نے فرمایا: تمہیں اُن عذابوں سے ڈرنا چاہیے جو تم سے پہلی اُمتوں پر اُن کی بداعمالیوں اور بد کرداریوں کی وجہ سے نازل ہوئے۔ پس اپنے اچھے بُرے حالات میں اُن کے احوال وواردات کو پیش نظر رکھو اور اس امر سے خائف وترساں رہو کہ کہیں تم بھی انہی جیسے نہ ہو جاؤ۔اگر تم نے ان کی دونوں (اچھی بری) حالتوں پر غور کرلیا ہے تو پھر ہر اس چیز کی پابندی کرو کہ جس کی وجہ سے عزت و برتری نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا اور دشمن ان سے دور رہے اور عیش وسکون کے دامن ان پر پھیل گئے۔اور نعمتیں سرنگوں ہو کر ان کے ساتھ ہولیں اور عزت وسرفرازی نے اپنے بندھن ان سے جوڑ لیے۔(وہ کیا چیزیں تھیں) یہ کہ وہ افتراق سے بچے اور اتفاق و یکجہتی پر قائم رہے۔اسی پر ایک دوسرے کو ابھارتے تھے اور اسی کی باہم سفارش کرتے تھے۔

(نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ ۱۹۲)

بسم الله الرحمن الرحيم

# اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کے اذہان کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شائع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گراں قدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

# چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیر نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس /پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ تجویز کرے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لئے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں ***Turabian Style*** میں درج ذیل ترتیب کے مطابق لکھے جائیں:

  مصنف کا لقب، مصنّف کا نام؛ کتاب کا نام، پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔ مثال کے طور پر:

  سید العلماء، علی نقی النقوی، تفسیر فصل الخطاب، مصباح القرآن ٹرسٹ، ۲۰۱۱، ج۱، ص ۱۴، لاہور، پاکستان۔
- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہٰذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- مجلّہ، مقالات کی ادبی، فنّی اور ظاہری آرائش اور عبارتوں کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

**Declaration No:** 7334

**ISSN** 2221-1659

جلد: ۶
اکتوبر تا دسمبر
2015
بمطابق
محرم الحرام
تا
ربیع الاول
۱۴۳۷ھ
شمارہ: ۴

سہ ماہی

علمی و تحقیقی

# نور معرفت

**مدیر اعلی**
سید حسنین عباس گردیزی

**مدیر**
سید رمیز الحسن موسوی

## مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
- ڈاکٹر ساجد علی سجانی
- ڈاکٹر سید راشد عباس
- ڈاکٹر کرم حسین ودھو
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
- سید علی مرتضی زیدی
- سید ثمر علی نقوی
- روشن علی

کمپوزنگ / ڈیزائننگ: بابر عباس

پرنٹر: پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شمارہ 130 روپے
زرِسالانہ 500 روپے

زرِسالانہ 150 ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرِسالانہ 070 ڈالر مڈل ایسٹ

نورالہدیٰ مرکز تحقیقات، نورالہدیٰ ٹرسٹ، محلّہ سادات، بارہ کہو اسلام آباد
www.nmt.org.pk | www.nht.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

**نوٹ:** ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

# فہرست


| نمبر شمار | موضوع | مؤلف | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | اداریہ | مدیر | ۷ |
| ۲ | قیامِ حضرت امام حسینؑ میں اہل کوفہ کے خطوط کا کردار | ڈاکٹر عباس حیدر زیدی | ۱۱ |
| ۳ | امام جعفر صادقؑ کی جانشینی: تاریخ کے تناظر میں ایک تحقیقی جائزہ | ڈاکٹر سجاد علی استوری | ۲۳ |
| ۴ | حضرت زیدؑ شہید کے قیام کے اسباب (ایک تحقیقی جائزہ) | ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی | ۳۷ |
| ۵ | انسانی تربیت کی ضرورت (افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں) | سید رمیز الحسن موسوی | ۵۹ |
| ۶ | ذرائع ابلاغ کا آغاز وارتقاء اور عصری اہمیت (ایک تحقیقی مطالعہ) | ڈاکٹر محمد ریاض | ۷۵ |
| ۷ | قرآن وسنت میں وحدت کا مقام | غلام محمد | ۹۹ |
| ۸ | تصوّرِ مذہب کے مختلف نظریے | حنا خراسانی رضوی | ۱۱۳ |
| ۹ | گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے اسباب پر اجمالی نظر | امل موسوی | ۱۳۹ |
| ۱۰ | امام علیؑ کی نگاہ میں وحدت کی ضرورت اور اہمیت (نہج البلاغہ کے تناظر میں) | ڈاکٹر محمد افضل | ۱۵۳ |

# "نَمُت" ایک نظر میں

" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات"، نور الہدیٰ ٹرسٹ کا ایک ذیلی ادارہ ہے جسے بطورِ اختصار "نمت" **(NMT)** پڑھا لکھا جاتا ہے۔ یہ ادارہ فاضل علماء کرام اور دانشوروں کی رہنمائی میں کام کر رہا ہے اور اِسے جن شخصیات کی سرپرستی حاصل ہے اُن کی اکثریّت حوزہ علمیہ قم سے تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ، معروف انٹرنیشنل یونیورسٹیز سے بھی تعلیم یافتہ اور مختلف جامعات میں تدریس و تحقیق کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ "نمت" کو ملکی شخصیات کے علاوہ عالمِ اسلام کے بعض بین الاقوامی علمی مراکز کے فاضل علماء کرام کا قلمی تعاون اور فکری رہنمائی بھی حاصل ہے۔

"نمت" کا نصب العین **(Vision)** مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی تشکیل کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم میں دینی آگہی کا فروغ اور قومی شعور بیدار کرنا "نمت" کا مشن **(Mission)** ہے۔ "نمت" کے اہداف **(Goals)** درج ذیل ہیں:

1. محققین کے درمیان رابطہ اور ہماہنگی ایجاد کرنا۔
2. نشر واشاعت کے عمل میں قومی رسائل وجرائد کے ساتھ تعاون۔
3. اسلامی تعلیمات کے تحقیق طلب موضوعات پر تحقیقات پیش کرنا۔
4. قومی اور معاشرتی مسائل کا اسلامی تعلیمات کے نکتۂ نظر سے حل پیش کرنا۔
5. ملت مسلمہ کے افراد کو درپیش عقیدتی اور فکری شبہات اور سوالات کا جواب پیش کرنا۔
6. دینی مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلباء میں تحقیق کا جذبہ اجاگر کرنا۔

جہاں تک "نمت" کی پالیسیوں **(Policies)** کا تعلق ہے تو ملکی سالمیت اور مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی حکمرانی کی غرض سے پاکستان کے قومی نظریہ (نظریۂ توحید) کو اجاگر کرنا اور پاکستانی قوم کے اندر یکجہتی اور وحدت کا شعور بیدار کرنا، اس ادارے کی اساسی پالیسی ہے۔ "نمت" کی پالیسی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے اس قوم میں پائی جانے والی بیمار دینی سوچ کا معالجہ اور فکری پسماندگی کا خاتمہ کیا جائے؛ تاکہ یہاں اسلامی تہذیب حاکم ہوسکے۔

"نمت" کی تگ و دَو اور سرگرمیوں کا دائرہ کار محض تعلیمی، تحقیقی میدان میں فعالیت میں محدود ہے اور یہ اپنے اہداف کے حصول کے لئے مختلف اسلامی فرقوں اور مذاہب کے درمیان بین المسالک ہماہنگی، تعمیری ڈائیلاگ اور درک متقابل کا قائل ہے۔ یہ ادارہ کسی خاص شخصیت کی تصنیفات پیش کرنے کی بجائے، ہر اپنے اہداف سے ہماہنگ، ہر تحقیقی کاوش کو اپنے دامنِ نشر و اشاعت میں جگہ دینے کا عہد کیے ہے۔ ہمفکر محققین کی تربیت بھی "نمت" کی اساسی پالیسی ہے۔ لہٰذا دینی مدارس کے اساتذہ، محققین، دینی اسکالرز، کالجز، یونیورسٹیز کے طلباء وطالبات، اہل قلم اور دانشور حضرات ہمارے خاص مخاطب شمار ہوتے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں "نمت" کا منہج بڑا واضح ہے۔ ہمارے منابع میں قرآن کریم سرفہرست ہے۔ اور ہم سنّت نبوی کے اُس طریق پر اعتماد کرتے ہیں جو ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا طریق ہے۔ ان منابع سے دینی تعلیمات کے اخذ و استخراج میں ہم مکتب تشیع کی اُس علمی تحقیقی روش کے علمبردار ہیں جو دینِ اسلام کے بنیادی منابع میں تتبّع، تفحّص اور اجتہاد کی بنیادوں پر استوار ہے۔

جہاں تک "نمت" کی کارکردگی کا تعلق ہے تو اب تک یہ ادارہ مختلف موضوعات پر 13 کتابیں اور سہ ماہی مجلّہ "نور معرفت" کے 29 شمارے (تقریباً 275 علمی، تحقیقی مقالات) پیش کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ ادارہ اب تک 8 سالانہ علمی سیمینارز کا انعقاد بھی کر چکا ہے اور ادارے کی ویب سائٹ بھی قابلِ استفادہ بنائی جا رہی ہے۔ بہر صورت، "نمت" کو اپنے تحقیقاتی منصوبے جاری رکھنے کے لئے دانشوروں، علماء اور اہل قلم کے قلمی اور فکری تعاون کے ساتھ ساتھ علم دوست احباب کا مالی تعاون بھی درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کرم فرماؤں کو اس ادارے کے لئے بہتر سے بہتر وسائل فراہم کرنے کے توفیق عطا فرمائے! (آمین!)

ڈائریکٹر "نمت"

**ڈاکٹر شیخ محمد حسنین**

# اداریہ

نور معرفت کا تیسواں شمارہ ماہ ربیع الاول کے مقدس مہینے میں اشاعت کے لئے تیار ہورہا ہے اور نبی اکرم ﷺ اور اُن کے چھٹے جانشین حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے یوم ولادت کے دن یہ سطریں رقم ہو رہی ہیں۔ اس مہینے کو بزرگان دین نے خصوصی اہمیت دی ہے اور یہ ایام اُمت مسلمہ کی ہم دلی ویکجہتی اور اُخوت ووحدت کی طرف گامزن ہونے کے لئے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ چونکہ ۱۲ ربیع الال اہل سنت کے نزدیک پیغمبر اکرم ﷺ کا یوم میلاد ہے اور ۱۷ ربیع الاول اہل تشیع کی روایات کے مطابق آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے چھٹے جانشین اور فقہ جعفریہ کے بانی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یوم ولادت ہے۔ لہٰذا یہ ہفتہ اُمت مسلمہ کے دو بڑے مسالک کے درمیان ہم آہنگی، وحدت اور یکجہتی کا ہفتہ ہے۔ اسی لئے عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کو سامراجی قوتوں سے نجات دلانی والی عظیم شخصیت امام خمینیؒ نے اس ہفتے کو اُمت کے درمیان وحدت وہم دلی کا مہینہ قرار دیا ہے اور تمام مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس ہفتے کو ''ہفتۂ وحدت'' کے عنوان سے منائیں اور رسول اللہ ﷺ سے عقیدت ومحبت کہ جو تمام مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے، کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان بنائی گئی مصنوعی خلیج کو ختم کرکے دشمنان اسلام کے تمام تفرقہ انگیز منصوبوں کا جواب دیں۔

افسوس کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان وحدت ویکجہتی کے لئے امام خمینیؒ اور مفتی مصر شیخ محمود شلتوتؒ جیسے رہنماؤں اور دوسرے منادیان وحدت کی مخلصانہ کاوشوں کے باوجود مسلمانوں کی وحدت اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کا خواب ابھی تک پورا نہیں ہوسکا۔ مسلمانوں کے درمیان تفرقے اور عدم برداشت کی اس صورت حال کے اسباب سے تقریباً پوری دنیائے اسلام آگاہ ہے اور میڈیا کے اس دور میں ان اسباب کو چھپانا بہت مشکل ہے۔ لیکن ایمان کی کمزوری اور دنیا پرستی نے مسلمان حکمرانوں سے ان تفرقہ انگیز علل واسباب کو ختم کرنے کی توفیق سلب کردی ہے۔ جہاں سانحہ منیٰ میں سینکڑوں حجاج کے خون پر پردہ ڈالنے کے لئے سرکاری سطح پر اہتمام کیا جائے اور یمن سے لے کر بحرین، عراق، فلسطین اور نائیجیریا کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے اُمت مسلمہ کے رہنما قرار پائیں

اور ساٹھ سال سے قبلۂ اوّل پر قابض ظالم وجابر یہودی حکومت کے تحفظ اور استحکام کے لئے اسلامی جہاد کے نام پر سامراجی قوتوں کے ہم قدم ہو کر لاکھوں شامی مسلمانوں کا خون بہایا جائے، وہاں وحدت و یکجہتی کی توفیقات سلب ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ جب بھی ظلم وستم کرنے والوں کا ساتھ دیا جائے اور شرک وکفر کے سربراہوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے تو اس وقت مسلمانوں پر تفرقہ اور انتشار کا عذاب ضرور مسلط ہوگا اور اُن کی ہوا ہمیشہ اُکھڑی رہے گی۔ اس سال میں گزشتہ تین ماہ تاریخ میں مسلمانوں کے لئے سخت ترین مہینے سمجھے جائیں گے۔ ماہ ذی الحجہ میں سینکڑوں حجاج کرام کی سانحہ منیٰ میں عبادت الٰہی کی حالت میں شہادت ناقابل فراموش واقعہ ہے اور اس سانحہ کے ذمہ داروں کا سیاہ ترین کارنامہ ہے۔ اسی طرح یمن کے مسلمانوں پر اُمت مسلمہ کے نام نہاد محافظین کی طرف سے بمباری بھی تاریخ مسلمین کے سیاہ ابواب میں اضافہ ہے۔ اور پھر حال ہی میں نواسۂ رسولؐ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے چہلم کے ایام میں پانچ سو نائیجیرین مسلمانوں کا قتل عام بھی یہودی خدمت گاروں کے ظلم وستم کی نئی داستان ہے۔

نائیجیریا میں امام خمینیؒ کے سامراج دشمن پیروکار عالم دین ''شیخ ابراہم زکزکی'' کے خلاف نائیجیرین فوج کی یلغار میں ۵۰۰ کے قریب شیعہ مسلمانوں کے علاوہ شیخ ابراہیم کے چار بیٹے اور زوجہ شہید کر دیئے جاتے ہیں اور خود شیخ کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس ظلم پر نہ تو انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں آواز بلند کرتی ہیں اور نہ عالمی میڈیا کو یہ ظلم وستم نظر آتا ہے۔ پاکستانی میڈیا نے تو اپنے ملک کے حجاج کے خون پر پردہ ڈال دیا تھا، نائیجیریا کے عاشقان اہل بیتؑ پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف کیسے آواز بلند کرتا۔

البتہ پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف جاری پاک افواج کی جنگ یقیناً قابل تحسین ہے، لیکن ابھی تعصب، دہشت گردوں سے ہمدردی کے جذبات اور فرقہ وارانہ سوچ کی بیخ کنی کی اشد ضرورت ہے، جس کے بغیر ضرب عضب جیسی جنگ میں کامیابی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم کو پرچم توحید تلے جمع کر کے ایک رسولؐ ایک کتاب اور ایک دین کی طرف لانا اور اسلامی جذبۂ اخوت پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ کام پاک افواج کا نہیں ہے، بلکہ اسلام کی نظریاتی سرحدوں کے محافظین کا کام ہے جو اپنے علم وانش کے ذریعے پاکستانی مسلمانوں کو دور جاہلیت کی عصبیت اور جاہلیت سے نجات دلانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ماہ ربیع الاول کا مہینہ اس حوالے سے اہم ترین مہینہ ہے جو دلوں کو جوڑنے اور رسالت مآب ﷺ کی انسان ساز سیرت کے عملی پہلوؤں کو قوم وملت کے لئے اُجاگر کرنے کا مہینہ ہے۔ ایسے مواقع سے جہاں حکومتوں کو فائدہ اُٹھانا چاہیے اور سیرت رسولؐ کی روشنی میں اپنی سیاست اور حکمرانی کا جائزہ لینا چاہیے وہاں علمائے کرام اور دانشوران قوم کا بھی فریضہ ہے کہ وہ ماہ ربیع الاول میں پورے سال کا جائزہ لیں کہ اُنہوں نے کس حد تک اپنے آپ کو اور قوم وملت کو سیرت رسول ﷺ سے ہم آہنگ کیا ہے اور اسلامی علوم ومعارف کی کس حد تک تبلیغ کی ہے۔

موجودہ پاکستانی معاشرے کو دیکھا جائے تو یہ معاشرہ سیرت رسول ﷺ اور قرآنی تعلیمات سے کوسوں دور نظر آتا ہے اور اس میں نبوی وقرآنی اقدار کے بجائے دور جاہلیت کی اقدار زیادہ مستحکم نظر آتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ حکمرانوں کی دین سے بے توجہی اور علمائے دین کی دنیا پرستی کی علامت ہے۔ جب حکمران دنیوی جاہ ومقام کے لئے سیاست کریں اور علمائے دین دینی تعلیمات کی ترویج کے بجائے مسلکی اور گروہی مسائل میں اُلجھے ہوئے ہوں تو وہاں دینی وقرآنی تعلیمات کے بجائے رسوم جاہلیت ہی کا دور دورا ہوگا اور کفر وشرک کی ثقافت ہی پروان چڑھے گی۔

نور معرفت کے پانچویں سال کا چوتھا شمارہ پیش خدمت ہے۔ نور معرفت کی ٹیم ہمیشہ کی طرح قرآن اور محمد وآل محمدؐ کی تعلیمات کو نشر کرنے اور معاشرے میں امن اور وحدت کا پیغام پھیلانے کی سعی کرتی رہی ہے۔ ہماری حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ اسلامی اقدار کے علمبردار اس جریدے میں تفرقہ انگیز تحریروں اور سیرت رسول ﷺ کے منافی مطالب سے پرہیز کیا جائے اور نہ مسلکی بنیادوں پر دین کی دعوت دی جائے۔ نور معرفت کے اس شمارے میں بھی اسلامی معارف سے متعلق چند تحقیقی نگارشات قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جارہی ہیں۔ ہمارے باقاعدہ قارئین نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ نور معرفت کے گزشتہ چند شماروں میں زیادہ تر نئے لکھنے والے محققین کی تحریریں شامل کی جارہی ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک کے نوجوان محققین اور اہل قلم کی نگارشات نور معرفت کے ذریعے علمی حلقوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ہمارا ایک اہم مقصد نئے محققین اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی اور تشویق ہے تاکہ ملک میں علمی وتحقیقی مطالعات کا رجحان بڑھے اور قوم میں دینی وعلمی ذوق سے سرشار ہو کر معاشرے کے مسائل

ومشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو اور مسلک اور فرقے کے بجائے دین اسلام کی ترویج ہو اور لوگ قرآن وسنت کے پیغام کو اپنے حقیقی منابع سے حاصل کرنے کے عادی ہو جائیں۔

اس بار بھی پرانے لکھنے والوں کے علاوہ چند نئے اہلِ قلم کے تحقیقی مقالات کا استقبال کیا گیا ہے۔ اس قلمی تعاون پر ہم اپنے تمام مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں۔ اس شمارے میں جہاں محرم الحرام کی مناسبت سے ایک تحریر شامل کی گئی ہیں وہاں ''ہفتۂ وحدت'' کی مناسبت سے دو مقالے اسلامی وحدت اور اتحاد بین المسلمین کے عنوان سے بھی پیش کیے جارہے ہیں۔ جو یقیناً پڑھنے والوں کو وحدت مسلمین کے نئے زاویوں سے آگاہ کرنے کا باعث بنیں گے۔

☆☆☆☆☆

# قیامِ حضرت امام حسین علیہ السلام میں اہل کوفہ کے خطوط کا کردار

ڈاکٹر عباس حیدر زیدی*
abbaspsc@yahoo.com

**کلیدی کلمات:** اہل کوفہ، مسلم بن عقیل، سلیمان بن صرد، بنی اُمیہ، عبید اللہ ابن زیاد

## خلاصہ

یزید کے خلاف امام حسینؑ کے قیام کے متعلق یہ فکر پائی جاتی ہے کہ امامؑ نے اہل کوفہ کے خطوط کی وجہ سے یزید کے خلاف قیام کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن اہل کوفہ نے بے وفائی دکھائی، چنانچہ امامؑ اپنے ہی شیعوں کی وجہ سے شہید کر دیئے گئے۔ اس مقالہ میں اہل کوفہ کے خطوط کا اس زمانے کے حالات کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے اور تاریخ میں جو خطوط ملتے ہیں ان کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ کے مطابق اہل کوفہ امامؑ کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب انہیں امامؑ کے مکہ آنے اور یزید کی بیعت سے انکار کر دینے کی خبر ملی۔
دوسری جانب کوفہ میں بنی اُمیہ کے حامیوں نے بھی یزید کو کوفہ کے حالات سے آگاہ کرنے کے لئے بہت سے خطوط لکھے جس کے بعد یزید نے ابن زیاد کو کوفہ پہنچ کر امامؑ کی تحریک کو دبانے اور اُنہیں قتل کرنے کا حکم دیا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ امام حسینؑ اہل کوفہ کے بلاوے کی وجہ سے عازم کوفہ ہوئے تاکہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر یزید کے خلاف جنگ کر سکیں۔

*۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔

حضرت امام حسینؑ نے یزید کی حکومت کے خلاف جو قیام کیا اس حوالے سے مسلمانوں کے یہاں یہ فکر پائی جاتی ہے کہ اہل کوفہ نے حضرت امام حسینؑ کو جو پے در پے خطوط لکھے ان ہی خطوط کے نتیجہ میں وہ شہر کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے وہاں جاکر یزید کے خلاف قیام کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ پہلے اپنے معتمد سفیر اور چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ روانہ کیا اور ان کے پیچھے خود بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عازم کوفہ ہوئے لیکن اہل کوفہ نے بے وفائی دکھائی، چنانچہ حضرت امام حسینؑ اپنے ہی شیعوں کی وجہ سے شہید کر دیے گئے۔اس فکر کو اس درجہ ترقی دی گئی کہ یہاں تک کہا جانے لگا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے ہی ساتھیوں کی بے وفائی کے نتیجہ میں شہید ہوئے بلکہ شیعوں نے خود ہی حضرت امام حسینؑ کو بلایا اور ان کو خود ہی شہید کر دیا۔

ہم اپنے اس مقالہ میں صرف اہل کوفہ کے خطوط کا اس زمانے کے حالات و واقعات کے تناظر میں جائزہ لیں گے اور اس حوالے سے تاریخ میں جو خطوط ملتے ہیں ان کا تجزیہ کریں گے تاکہ حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکے۔ مقتل لہوف میں اس طرح سے منقول ہے کہ:

”وسمع أهل الكوفة بوصول الحسين عليه السلام الى مكة وامتناعه من البيعة ليزيد فاجتمعوا فی منزل سليمان بن صرد الخزاعی۔ (1)

”اہل کوفہ نے جب امام حسینؑ کی مکہ میں تشریف آوری اور یزید سے بیعت کے انکار کی خبر سنی تو انہوں نے سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر اجتماع کیا۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کوفہ امام حسینؑ کی طرف جب متوجہ ہوئے انہیں یہ خبر ملی کہ حضرت امام حسینؑ مکہ آچکے ہیں اور یزید کی بیعت سے انکار کر دیا ہے۔یہ کہنا درست نہیں کہ حضرت امام حسینؑ اہل کوفہ کے بلاوے کی وجہ سے عازم کوفہ ہوئے تاکہ زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر یزید کے خلاف جنگ کر سکیں۔ اس اجتماع میں جو سلیمان بن صرد کے گھر منعقد ہوا تھا سلیمان اس طرح مخاطب ہوئے:

”يا معشر الشيعة انكم قد علمتم بأن معاوية قد هلك وصار الى ربه وقدم على عمله وقد قعد فی موضعه ابنه يزيد وهذا الحسين بن علی عليهما السلام قد خالفه وصار الى مكة هاربا من طواغيت آل أبی سفيان وأنتم شيعته وشيعة أبيه من قبله وقد احتاج الى نصرتكم اليوم

فان کنتم تعلمون انکم ۔ ناصروہ ومجاھدوا عدوہ فاکتبوا الیہ وان خفتم الوھن والفشل فلا تغروا الرجل من نفسہ۔" (2)

"اے شیعو! تم نے سنا کہ معاویہ ہلاک ہو چکا ہے اور اس کا بیٹا یزید اس کا جانشین بن بیٹھا ہے اور نیز یہ بھی تم جانتے ہو کہ حسینؑ ابن علیؑ نے اس کی مخالفت کی ہے اور بنی امیہ کے ستم کاروں کے شر سے بچنے کے لئے خانہ خدا میں پناہ لے رکھی ہے۔ تم ان کے والد کے شیعہ ہو اور آج امام حسینؑ تمہاری نصرت کے ضرورت مند ہیں۔ اگر تم ان کی مدد کرنے اور ان کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کا ارادہ رکھتے ہو تو اپنی آمادگی کا اظہار کرو اور امام کو خط کے ذریعے سے اطلاع کرو اور اگر تم ڈرتے ہو کہ تمہارے اندر سستی و غفلت پیدا ہو گی تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو اور انہیں فریب نہ دو۔"

یہ مختصر لیکن اہم اجتماع تھا کہ جو سلیمان بن صرد کے گھر منعقد ہوا تھا، اس تقریر میں وہ اہل کوفہ کو مطلع کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے مکہ میں خانہ خدا میں پناہ لی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ مدینہ سے مکہ اہل کوفہ کے خطوط کی وجہ سے نہیں آئے تھے، بلکہ جب اہل کوفہ کو معلوم ہوا کہ آپؑ مکہ میں پناہ لئے ہوئے ہیں تو آپؑ کی جانب متوجہ ہوئے۔ سلیمان بن صرد نے اہل کوفہ کی وفاداری اور ساتھ ہی ان کی بے وفائی کو بھی اپنی تقریر میں مد نظر رکھا تھا، لیکن اس وقت کے ماحول میں سب نے یہی جواب دیا کہ ہم انہیں دعوت دیں گے اور ان کے دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے اپنی جان ان کی راہ میں نچھاور کر دیں گے۔ چنانچہ سلیمان بن صرد نے اس مضمون میں حضرت امام حسینؑ کو خط لکھا:

"(بسم اللہ الرحمن الرحیم) ۔ للحسین بن علی أمیر المؤمنین، من سلیمان بن صرد الخزاعی، والمسیب بن نجیة، و رفاعة بن شداد، وحبیب بن مظاھر، وعبد اللہ بن وائل، و شیعة من المؤمنین، سلام علیك ۔ أما بعد فالحمد اللہ الذی قصم عدوك وعدو أبیك من قبل الجبار العنید الغشوم الظلوم الذی ابتزھذہ الأمة أمرھا وغصبھا فیئھا وتأمر علیھا بغیر رضی منھا ثم قتل خیارھا واستبقی شرارھا وجعل مال اللہ دولة بین جبابرتھا وعتاتھا فبعدا لہ کما بعدت ثمود ثم انہ لیس علینا امام غیرك فأقبل لعل اللہ یجمعنا بك علی الحق والنعمان بن بشیر فی قصر الامارة ولسنا نجمع معہ فی جمعة ولا جماعة ولا نخرج معہ فی عید ولو قد بلغنا

انك أقبلت أخرجناه حتى يلحق بالشام والسلام عليك ورحمة الله وبركاته يا بن رسول الله وعلى أبيك من قبلك ولاحول ولاقوة الا بالله العلى العظيم۔ " (3)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حسینؑ ابن علیؑ کے نام! سلیمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نجبۃ، رفاعہ بن شداد، حبیب ابن مظاہر، عبداللہ بن وائل اور بعض دیگر مؤمنین اور شیعوں کی طرف سے۔ سلام کے بعد ہم خداوند عالم کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے آپ کے والد گرامی کے دشمن کو ہلاک کیا۔ وہ ایک ایسا ظالم خونخوار شخص تھا جس نے امت مسلمہ کی حکومت پر ظلم و ستم کے ساتھ قبضہ کیا، مسلمانوں کے بیت المال کو غصب کیا اور ان کی رضامندی کے بغیر حاکم بن بیٹھا۔ نیک لوگوں کو تہہ تیغ کیا اور فاسق وفاجر لوگوں کو چھوڑ دیا۔ خداوند عالم کے مال کو جابروں اور سرکشوں کے لئے وقف کر دیا۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہوا، جس طرح قوم ثمود دور ہوئی اور ہمارا اس وقت آپ کے سوا اور کوئی امام و پیشوا نہیں ہے اور بہت مناسب ہے کہ آپ قدم رنجہ فرماہوں اور ہمارے شہر میں تشریف لے آئیں۔ اُمید ہے کہ خداوند عالم آپ کے وسیلہ سے ہمیں راہ سعادت کی راہنمائی فرمائے گا۔ اس وقت کوفہ کا حاکم نعمان بن بشیر قصر دارالامارہ میں ہے لیکن ہم نماز جمعہ اور نماز پنجگانہ میں حاضر نہیں ہوتے اور نمازِ عید کے لئے بھی اقتداء نہیں کرتے۔ اگر ہم اس بات سے باخبر ہو جائیں کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لا رہے ہیں تو اسے ہم کوفہ سے نکال کر شام کی طرف روانہ کر دیں گے۔ اے پیغمبر کے فرزند! آپ پر اور آپ کے والد گرامی پر ہمارا سلام۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔"

انہوں نے یہ خط عبداللہ بن سبع ہمدانی اور عبداللہ بن وال تمیمی کے ہاتھوں روانہ کیا۔ یہ دونوں افراد تیزی کے ساتھ نکلے اور دس رمضان المبارک تک حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ پھر دو دن کے بعد قیس بن مسہر صیداوی، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن الکدن ارجی اور عمارہ بن عبید سلولی کو بھی کوفہ سے روانہ کیا گیا جو ایک سو پچاس خطوط لے کر روانہ ہوئے۔ ان خطوط پر ایک، دو، تین یا چار افراد کے دستخط تھے۔ مقتل لہوف کے مطابق ایک دن میں چھ سو خطوط پہنچے۔ اس کے علاوہ متواتر خطوط پہنچتے رہے یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ اہل کوفہ کی طرف سے آخری خط ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے توسط سے حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچا جس کا مضمون یہ تھا:

”(بسم الله الرحمن الرحيم) لحسين بن على من شيعته من المؤمنين والمسلمين: أما بعد فحيهلا فان الناس ينتظرونك ولا رأى لهم فى غيرك فالعجل العجل والسلام عليك۔“ (4)

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حسینؑ ابن علیؑ کے نام یہ خط ان کے شیعوں کی جانب سے ہے جو مؤمن و مسلم ہیں۔اما بعد: اے فرزند پیغمبر! جلد سے جلد ہماری طرف آجایئے کیونکہ سب لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپؑ کے علاوہ ان کا دل کسی دوسرے کے لئے نہیں تڑپ رہا ہے لہٰذا جلدی کیجئے جلدی۔والسلام علیک۔“

ایک اور اہم خط شبعث بن ربعی، حجار بن ابجر،یزید بن حارث بن یزید بن رویم، عروہ بن قیس، عمرو بن حجاج زبیدی اور محمد بن عمر تمیمی نے حضرت امام حسینؑ کی طرف روانہ کیا کہ جس کا مضمون یہ تھا:

”أما بعد فقد اخضر الجنات وأينعت الثمار وطمت الجمام فاذا شئت فاقدم على جند لك مجند والسلام عليك۔“ (5)

”امابعد: باغ سرسبز ہو چکے ہیں۔ پھل پک چکے ہیں اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے اور سبز پتوں نے درختوں کی ہریالی میں اضافہ کردیا ہے۔آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیں تو آپ اپنے لئے ایک تیار اور آمادہ فوج پائیں گے۔والسلام علیک۔“

اس خط کا مضمون کچھ اس طرح سے رقم کیا گیا تھا کہ مقتل لہوف کے مطابق خود حضرت امام حسینؑ نے پوچھا کہ یہ خط کن لوگوں نے لکھا ہے۔تمام پیغام رساں حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت امام حسینؑ نے ان سب کے خطوط پڑھ کر وہاں کے لوگوں کی احوال پرسی کی پھر ہانی بن ہانی السبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی جو نامہ بروں کے سلسلے کے آخری رکن تھے، کے ہمراہ کوفیوں کے خطوط کا جواب اس طرح لکھا:

”(بسم الله الرحمن الرحيم) من حسين بن على الى الملا من المؤمنين والمسلمين أما بعد فان هانئا وسعيدا قدما على بكتبكم وكانا آخر من قدم على من رسلكم وقد فهمت كل الذى اقتصصتم وذكرتم ومقالة جلكم انه ليس علينا امام فأقبل لعل الله أن يجمعنا بك على الهدى والحق وقد بعثت اليكم أخى وابن عمى وثقتى من أهل بيتى وأمرته أن يكتب الى بحالكم وأمركم ورأيكم فان كتب الى أنه قد أجمع رأى ملئكم وذوى الفضل والحجى منكم على مثل ما قدمت على به رسلكم

وقرأت فی کتبکم أقدم علیکم وشیکا ان شاء اللہ فلعمری ما الامام الا العامل بالکتاب والآخذ بالقسط والدائن بالحق والحابس نفسہ علی ذات اللہ والسلام۔" (6)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط حسینؑ بن علیؑ کی طرف سے مؤمنین و مسلمین کے ایک گروہ کے نام بعد از حمد خدا، ہانی اور سعید تمہارے خطوط لے کر ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ یہ دونوں ان نامہ رسانوں میں سے آخری نامہ رساں ہیں جو اب تک ہمارے پاس آچکے ہیں۔ میں نے ان تمام چیزوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے جس کا قصہ تم لوگوں نے بیان کیا ہے اور جن باتوں کا تم لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ تم میں سے اکثر و بیشتر لوگوں کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی امام نہیں ہے لہٰذا آجایئے، شاید خداوند عالم آپ کے وسیلہ سے ہم لوگوں کو ہدایت و حق پر جمع کردے۔ میں تمہاری طرف اپنے بھائی اور چچا کے بیٹے (مسلم بن عقیلؑ) اور اپنے خاندان کے اس فرد کو بھیج رہا ہوں جس پر مجھے اعتماد ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ وہاں جا کر تمہاری آراء و خیالات سے مجھ کو مطلع کریں، اب اگر انہوں نے مجھ کو مطلع کر دیا کہ تمہارے خیالات وہی ہیں جو تم نے اپنے خطوط میں تحریر کیے ہیں، جسے میں نے دقت سے پڑھا ہے اور صرف عوام نہیں بلکہ تمہارے ذمہ دار اور صاحبان فضل و شرف افراد بھی اس پر متفق ہیں تو انشاء اللہ بہت جلد میں تم لوگوں کے پاس آجاؤں گا۔ قسم ہے میری جان کی ! امام تو بس وہی ہے جو کتاب خدا پر عمل کرنے والا ہو، عدل و انصاف قائم کرنے والا، حق پر قائم، اس کا اجراء کرنے والا اور اللہ کی راہ میں خود کو وقف کرنے دینے والا ہو۔ والسلام۔"

حضرت امام حسینؑ نے جناب مسلم بن عقیلؑ کو بلایا اور قیس بن مسہر صیداوی، عمارہ بن عبید السلولی اور عبدالرحمٰن عبداللہ بن الکدن ارجی کے ہمراہ آپ کو روانہ کیا اور فرمایا کہ اگر تم نے محسوس کیا کہ لوگ اپنے کیے ہوئے وعدہ پر برقرار ہیں تو مجھے فوراً اس سے مطلع کرنا۔ حضرت مسلمؑ اپنے تینوں ساتھیوں قیس بن مسہر صیداوی، عمارہ بن عبید السلولی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ الکدن ارجی کے ہمراہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے اور جناب مختار بن ابو عبیدہ ثقفی کے گھر مہمان ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی لوگ جوق در جوق حضرت مسلم بن عقیلؑ کی خدمت میں آکر شرفیاب ہونے لگے اور ان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ جب شیعہ اکٹھا ہو گئے تو حضرت مسلمؑ نے انہیں حضرت امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنایا جسے سن کر

سب رونے لگے۔ اسی دوران عابس بن ابی شبیب شاکری، حبیب ابن مظاہر، سعید بن عبداللہ حنفی اور دیگر لوگوں نے اپنی مدد و نصرت کا یقین دلایا۔ حضرت مسلمؑ کے یہاں شیعوں کی آمد و رفت کا سلسلہ اس طرح سے جاری ہو گیا کہ ان کی رہائش گاہ جانی پہچانی ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کی خبر اس وقت کے کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو بھی ہو گئی۔

نعمان بن بشیر نے جب کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیلؑ کی آمد اور حضرت مختار کے یہاں قیام کی خبر سنی تو منبر پر آیا اور اس نے اہل کوفہ کو فتنہ و پراکندگی کی طرف بڑھنے سے ڈرایا لیکن اس کی تقریر ایسی تھی کہ بنو اُمیہ کے ایک حامی عبداللہ بن مسلم بن سعید حضرمی نے اس سے کہا کہ یہ وقت سخت گیری کا ہے جبکہ تم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ناتواں اور ضعیف لوگوں کی سیاست اختیار کی ہے، لیکن نعمان نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا جس پر اس نے یزید بن معاویہ کو ایک خط لکھا اور کہا:

"فان مسلم بن عقیل قد قدم الکوفة فبایعته الشیعة للحسین بن علی، فان کان لك بالکوفة حاجة فابعث الیها رجلا قویا ینفذ امرك ویعمل مثل عملك فی عدوك، فان النعمان بن بشیر رجل ضعیف وهو یتضعف۔" (7)

"امابعد! مسلم بن عقیلؑ کوفہ پہنچ چکے ہیں اور حسینؑ ابن علیؑ کے چاہنے والوں نے ان کی بیعت کر لی ہے۔ اب اگر تم کوفہ کو اپنی قدرت میں رکھنا چاہتے ہو تو کسی ایسے قوی انسان کو بھیجو جو تمہارے حکم کو نافذ کر سکے اور اپنے دشمنوں کے سلسلے میں تمہارے ہی جیسا اقدام کر سکے کیونکہ نعمان بن بشیر ایک ناتواں انسان ہے یا شاید خود کو ضعیف دکھانا چاہ رہا ہے۔"

اسی طرح عمارہ بن عقبہ اور عمر بن سعد بن ابی وقاص نے بھی ایسے ہی خطوط لکھ کر یزید کو کوفہ کے حالات سے باخبر کیا۔

ہم یہاں ان خطوط کا ذکر کر رہے ہیں کہ جن کے ذریعے ایک طرف اہل کوفہ کے مخلص شیعہ حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھ کر بلا رہے ہیں اور دوسری طرف یزید کے پیروکار اُسے خط لکھ کر شہر کوفہ کے حالات سے باخبر کر رہے ہیں اور کسی سخت گیر گورنر کو کوفہ پر مسلط کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ابی مخنف کی روایت کے مطابق جب فقط دو دنوں میں یزید کے پاس خطوط کا انبار لگ گیا تو اس نے اپنے خاص غلام سرجون کو بلایا اور

اس سے مشورہ طلب کیا۔ اس کے غلام نے معاویہ کا خط اُسے پیش کیا کہ اگر کوفہ ہاتھ سے نکلا جارہا ہو تو وہاں عبید اللہ ابن زیاد کو مسلط کر دینا۔یزید نے ابن زیاد کو جو اس وقت بصرہ کا گورنر تھا خط لکھا کہ :

''أما بعد فانه کتب الی شیعتی من أهل الکوفة یخبرونني أن ابن عقیل بالکوفة یجمع الجموع لشق عصا المسلمین فسر حین تقرأ کتابی هذا حتی تأتی أهل الکوفة فتطلب ابن عقیل کطلب الخرزة حتی تثقفه فتوثقه أو تقتله أو تنفیه والسلام۔'' (8)

''اما بعد کوفہ سے میرے پیروؤں نے خط لکھ کر مجھ کو خبر دی ہے کہ ابن عقیل کوفہ میں جمع ہو کر مسلمانوں کے اجتماع کو درہم برہم کر رہا ہے تو تم میرا خط پڑھتے ہی رختِ سفر باندھ کر کوفہ پہنچ جاؤ اور ابن عقیل کی جستجو میں لگ جاؤ جیسے کوئی اپنے گم شدہ گوہر کو تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اسے اپنی گرفت میں قید کرلو یا قتل کر دو یا پھانسی پر چڑھادو۔ والسلام۔''

کوفہ سے یزید کو لکھے جانے والے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کوفہ میں حضرت امام حسینؑ کے چاہنے والے تھے، اسی طرح یزید کے حامی بھی موجود تھے۔

جب حضرت مسلم بن عقیلؑ کو عبید اللہ ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے اور کوفہ کے حوالے سے اس کی سخت گیر حکمت عملی کی اطلاع ملی تو آپ جناب مختار کے گھر سے جناب ہانی ابن عروہ کے گھر منتقل ہوگئے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اٹھارہ ہزار لوگوں نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کے ہاتھوں بیعت کی جس کے بعد جناب مسلمؑ نے حضرت امام حسینؑ کے نام ایک خط لکھ کر اسے عابس بن شبیب شاکری کے ہاتھوں روانہ کیا کہ جس میں انہوں نے لکھا کہ کوفہ کے اٹھارہ ہزار لوگوں نے ان کی بیعت کرلی ہے۔ لہٰذا جلد یہاں تشریف لائیں۔ حضرت امام حسینؑ نے عراق جانے کا راستہ اختیار کیا اور جب حاجر بطن رمہ تک پہنچے تو وہاں پہنچ کر قیس بن مسہر صیداوی کو اہل کوفہ کی طرف روانہ کیا اور ان کے ہمراہ اہل کوفہ کے نام ایک خط لکھا کہ :

''وحدثنی محمد بن قیس ان الحسین اقبل حتی اذا بلغ الحاجر من بطن الرمة بعث قیس بن مسهر الصیداوی الی أهل الکوفة وکتب معه الیهم: بسم الله الرحمن الرحیم من الحسین بن علی الی اخوانه من المؤمنین والمسلمین، سلام علیکم فانی احمد الیکم الله الذی لا اله الا هو، اما بعد فان کتاب مسلم بن عقیل جائنی یخبرنی فیه بحسن رأیکم واجتماع ملئکم علی نصرنا والطلب بحقنا

فسألت الله ان يحسن لنا الصنع وان يثيبكم على ذلك أعظم الاجر، وقد شخصت اليكم من مكة يوم الثلاثاء لثمان مضين من ذى الحجة يوم التروية فاذا قدم عليكم رسولى فاكمشوا امركم وجدوا، فأنى قادم عليكم فى أيامى هذه ان شاء الله والسلام عليكم و رحمة الله وبركاته۔" (9)

بسم الله الرحمن الرحيم۔ یہ خط حسینؑ ابن علیؑ کی جانب سے اپنے مؤمنین و مسلمین بھائیوں کے نام۔ سلام علیکم، میں اس خدا کی حمد کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ امابعد، حقیقت یہ ہے کہ مسلم بن عقیلؑ کا خط مجھ تک پہنچ چکا ہے، اس خط میں انہوں نے مجھے خبر دی ہے کہ تم لوگوں کی رائے اچھی ہے اور تمہارے بزرگوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے اور ہمارے حق کو ہمارے دشمنوں سے واپس لے لیں گے تو میں خدا سے سوال کرتا ہوں کہ وہ ہمارے لئے اچھی راہ قرار دے اور اس کے ثواب میں تم لوگوں کو اجر عظیم سے نوازے۔ اس سے تم لوگ آگاہ رہو کہ میں بروز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ یوم التراویہ مکہ سے نکل چکا ہوں لہٰذا جب میرا نامہ بر تم لوگوں تک پہنچے تو جو کام تم کو کرنا چاہیے اس کی تدبیر میں لگ جاؤ اور اس مسئلہ میں بھرپور کوشش کرو کیونکہ میں انشاء اللہ انہی چند دنوں میں تم تک پہنچنے والا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔"

لیکن جب قیس بن مسہر کوفہ روانہ ہوئے تو قادسیہ کے مقام پر حصین ابن تمیم نے آپ کو گرفتار کرکے عبید اللہ ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ جہاں آپ کو قصر سے نیچے پھینک کر شہید کر دیا گیا۔

جب عبید اللہ ابن زیاد نے حضرت مسلم بن عقیلؑ اور ہانی ابن عروہ کو شہید کر دیا تو اس کی اطلاع یزید کو ایک خط کے ذریعے دی۔ یزید نے اس فعلِ بد کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ:

"قد بلغنى أن أهل الكوفة قد كتبوا الى الحسين فى القدوم عليهم، وانه قد خرج من مكة متوجها نحوهم، وقد بلى به بلدك من بين البلدان، وأيامك من بين الأيام، فان قتلته، والا رجعت الى نسبك والى أبيك عبيد، فاحذر أن يفوتك۔" (10)

مجھے خبر ملی ہے کہ اہل کوفہ نے حسینؑ کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دی ہے اور وہ ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے کوفہ کی جانب چل پڑے ہیں اور اب کوفہ کی گورنری تیرے لئے امتحان ہے اگر تو نے حسینؑ کو قتل کر دیا تو ٹھیک وگرنہ میں اعلان کروں گا کہ تیرا حسب نسب

درست نہیں ہے اور تیرا نسب تیرے باپ کی طرف لوٹا دوں گا اور لوگوں سے کہوں گا کہ تو اور تیرا باپ زیاد بن ابیہ آلِ قریش سے نہیں ہیں اور تیرے سابقہ حسب و نسب (یعنی تو ولدالزنا ہے) سے تمام لوگوں کو مطلع کروں گا۔ پس خبردار حسینؑ کو زندہ نہیں جانا چاہیے۔"

اس خط میں یزید نے اس کی دُکھتی رَگ پر ہاتھ رکھا تھا کیونکہ وہ ولد الزنا تھا، لیکن معاویہ نے اس کے باپ زیاد کو اپنا بھائی قرار دیا تھا چنانچہ اس خط میں یزید نے عبید اللہ ابن زیاد کو دھمکی دی کہ اگر تو نے حسینؑ ابن علیؑ کو قتل نہ کیا تو میں اعلان کرادوں گا کہ تیرا حسب و نسب صحیح نہیں ہے۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض خطوط حضرت امام حسینؑ کو کوفہ کی جانب دعوت دینے کے لئے لکھے گئے اور ان میں ان لوگوں کے خطوط بھی شامل تھے کہ بقول فرزدق جن کے دل تو امام حسینؑ کے ساتھ تھے لیکن تلواریں آپؑ کے مد مقابل تھیں اور بعض خطوط یزید کے حامیوں نے یزید کو کوفہ کی صورتحال سے آگاہ کرنے کے لئے لکھے تھے اور درخواست کی تھی کہ نعمان بن بشیر کی جگہ کسی سخت گیر گورنر کو کوفہ پر مسلط کردیا جائے۔ کوفہ کے کچھ لوگوں کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ خطوط کو حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پیش کریں یا خود ان سے ملاقات کریں ان میں عبداللہ بن سبع ہمدانی، عبداللہ بن وال تیمی، قیس بن مسہر صیداوی، ہانی بن ہانی سبیعی، عمارہ بن عبیدالسلولی، سعید بن عبداللہ حنفی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ ارجی شامل ہیں۔

اگرچہ خود امام حسینؑ کو معلوم تھا کہ اہل کوفہ ان سے دغا کریں گے لیکن فریضہ امامت ادا کرتے ہوئے آپ کوفہ روانہ ہوئے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب اہل کوفہ کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کردیا ہے اور آپ مکہ میں قیام پذیر ہیں تو انہوں نے آپؑ کو کوفہ کی جانب آنے کی دعوت دی۔ ایسی حالت میں جبکہ مکہ میں یزید کی مخالفت کو جاری رکھنے کی وجہ سے آپؑ کو شہید کرنے کے باقاعدہ احکامات جاری کردیئے گئے تھے آپ کس شہر کا انتخاب کرتے؟

کوفہ چونکہ جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے اہم مرکز تھا اور وہاں کے لوگوں نے مسلسل خطوط لکھ کر اپنی حمایت کا مکمل یقین دلایا تھا لہٰذا حضرت امام حسینؑ کا وہاں جانے کا مقصد ان پر اتمام حجت کرنا تھا اگرچہ آپ سمجھتے تھے کہ یہی اہل کوفہ آپؑ کو شہید کردیں گے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے کوفہ کے راستے میں ایک شخص کو یہی جواب دیا تھا کہ: "ھذہ کتب أھل الکوفۃ الی ولا أراھم الا قاتلی۔ یہ اہل کوفہ کی

خطوط ہیں اور یہی اہل کوفہ مجھے قتل کردیں گے۔"(11)اہل کوفہ میں جن لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھے ان میں سے بعض کی نشاندہی آپؑ نے بروز عاشور فرمائی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

"یا شبث بن ربعی، یا حجار بن أبجر، یا قیس بن الأشعث، یا یزید بن الحارث، ألم تکتبوا الی أن قد أینعت الثمار و أخضر الجناب، و انما تقدم علی جند لك مجند؟ "(12)

"اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث! کیا تم ہی لوگوں نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ پھل پکنے کے قریب ہیں، درخت سرسبز و شاداب ہیں اور تیار لشکر آپ کے لئے حاضر ہے؟"

لیکن ان لوگوں نے صاف انکار کردیا۔

کوفہ میں حقیقی شیعوں کے تعداد قلیل تھی اور جن لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی ان میں سے بعض نے کوفہ کی صورتحال کے پیش نظر حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھ کر اپنی حمایت کا یقین دلایا اور بعض نے حقیقی معنوں میں حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھے، لیکن ایسے شیعوں کی تعداد مختصر تھی۔ لہٰذا یہ قرار دینا کہ اہل کوفہ چونکہ شیعہ تھے اور انہوں نے ہی حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھ کر بلایا، لہٰذا شیعوں نے ہی حضرت امام حسینؑ کو شہید کیا، یہ فقط پروپیگنڈہ ہے جس کا ادراک اہل کوفہ کی جانب سے حضرت امام حسینؑ اور یزید کو لکھے جانے والے خطوط اور ان میں درج مضامین سے ہوتا ہے کہ جس میں ایک طرف اہل کوفہ کے چند مخلص شیعہ حضرت امام حسینؑ کو خطوط لکھ رہے تھے اور دوسری طرف یزید کے حمایتی خطوط لکھ کر اسے کوفہ کی صورتحال سے آگاہ کررہے تھے۔

یزید اہل کوفہ کے ان ہی خطوط کی وجہ سے کوفہ کی جانب متوجہ ہوا اور اس نے عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ پر مسلط کردیا جس نے وہاں پہنچ کر سخت گیر حکمت عملی اپنائی اور جب ابن زیاد کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت امام حسینؑ کوفہ کے قریب پہنچ چکے ہیں تو کربلا میں کوفہ سے پے در پے فوج کے گروہ روانہ کیے۔ شام سے بھی یزید کی جانب سے فوج روانہ کی گئی۔ اس کے علاوہ کوفہ سے روانہ ہونے والی فوج کے سربراہوں میں عمر بن سعد، حصین بن تمیم، شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، شمر بن ذی الجوشن، قیس بن اشعث، محمد بن اشعث، یزید بن حارث، عمرو بن حریث، عمرو بن حجاج اور عزرۃ بن قیس احمسی جیسے یزید کے حمایتی شامل ہیں کہ جنہوں نے حضرت امام حسینؑ کو ان کے خاندان اور ساتھیوں سمیت شہید کردیا۔

*****

## حوالہ جات


1۔ابن طاووس، سید، اللھوف فی قتلی الطفوف، الأولی، ۱۴۱۷، مہر، أنوار الہدی۔ قم۔ ایران، ص ۲۲

2۔ایضاً۔ ص ۲۲ - ۲۳

3۔ایضاً۔ ص ۲۳

4۔أبو مخنف الأزدی، مقتل الحسین (ع)، تعلیق: حسین الغفاری، مطبعۃ العلمیۃ۔ قم۔ ص ۱۶

5۔طبری، تاریخ الطبری، مراجعۃ و تصحیح وضبط: نخبۃ من العلماء الأجلائ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات - بیروت - لبنان، قوبلت ہذہ الطبعۃ علی النسخۃ المطبوعۃ بمطبعۃ "بریل" بمدینۃ لندن فی سنۃ ۱۸۷۹م۔ ج ۴۔ ص ۲۶۲

6۔ایضاً۔ ج ۴۔ ص ۲۶۲

7۔أبو مخنف الأزدی، مقتل الحسین (ع)، تعلیق: حسین الغفاری، مطبعۃ العلمیۃ۔ قم۔ ص ۲۲

8۔طبری، تاریخ الطبری، مراجعۃ و تصحیح وضبط: نخبۃ من العلماء الأجلائ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات۔ بیروت۔ لبنان، قوبلت ہذہ الطبعۃ علی النسخۃ المطبوعۃ بمطبعۃ "بریل" بمدینۃ لندن فی سنۃ ۱۸۷۹م۔ ج ۴۔ ص ۲۶۵

9۔أبو مخنف الأزدی، مقتل الحسین (ع)، تعلیق: حسین الغفاری، مطبعۃ العلمیۃ۔ قم۔ ص ۷۱ - ۷۲

10۔یعقوبی، أحمد بن أبی یعقوب بن جعفر بن وہب ابن واضح الکاتب العباسی المعروف بالیعقوبی، تاریخ الیعقوبی، مؤسسۃ نشر فرہنگ أہل بیت علیہم السلام۔ قم۔ ایران۔ ج ۲۔ ص ۲۴۲

11۔ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، تحقیق وتدقیق و تعلیق: علی شیری، الأولی، ۱۴۰۸ھ۔ ۱۹۸۸م، دار احیاء التراث العربی۔ بیروت۔ لبنان ج ۸۔ ص ۱۸۳

12۔مفید، الشیخ، الارشاد، مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام لتحقیق التراث، الثانیۃ، ۱۴۱۴۔ ۱۹۹۳ م، دار المفید للطباعۃ والنشر والتوزیع۔ بیروت۔ لبنان، ج ۲۔ ص ۹۸

# حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی جانشینی

(تاریخ کے تناظر میں ایک تحقیقی جائزہ)

ڈاکٹر سجاد علی استوری*
drastori@yahoo.com

**کلیدی کلمات:** نزاریہ، مستعالیہ، اسماعیلیہ، نص، بوہری، دروز، قرامطہ، خالصہ، مبارکیہ، شمطیہ

## خلاصہ

حضرت امام جعفر صادقؑ شیعہ اثنا عشریہ کے چھٹے اور اسماعیلیوں کے پانچویں امام ہیں۔ آپ کی مدت امامت تقریباً چونتیس سال ہے۔ آپؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کے ماننے والے دو بنیادی فرقوں اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ میں تقسیم ہوئے۔ اثنا عشریہ کے مطابق آپؑ نے اپنے بیٹے موسیٰ کاظمؑ کی امامت پر نص بیان کی تھی۔ جبکہ اسماعیلیوں کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک اور بیٹے حضرت اسماعیل پر نص امامت کی تھی۔ عباسی حکمرانوں کی سختیوں کی وجہ سے امام جعفر صادقؑ کے اصل جانشین کا اعلان عمومی نہیں ہوا بلکہ انتہائی احتیاط اور تقیہ کے عالم میں اس کا اعلان ہوا۔ جس کی وجہ سے آپؑ کے جانشین کے بارے میں شک و شبہات پیدا ہو گئے۔

بعض قدیم مورخین کے مطابق حضرت امام جعفر صادقؑ کی رحلت کے ساتھ ہی آپؑ کے چار الگ الگ بیٹوں کی امامت کے پیروکار پیدا ہو گئے۔ عبداللہ افطح بن جعفر کے ماننے والے افطحیہ کہلائے جو بعد میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے معتقد ہو گئے۔ اسی طرح محمد الدیباج بن جعفر کی امامت کا دعویٰ کیا گیا بعد میں انہوں نے بھی حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کی طرف رجوع کیا۔ اسماعیل بن جعفر کی امامت کے قائلین کا سلسلہ جاری رہا جو اب تک موجود ہیں۔ دوسری طرف امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کے ماننے والے آج دنیائے اسلام کے دوسرے بڑے فرقہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔

---

*۔

## مقدمہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ماہ ربیع الاول ۸۰ھ یا ۸۳ھ میں مدینہ میں آنکھ کھولی اور مدینہ میں ۱۴۹ھ کو ماہ شوال میں انتقال فرما گئے۔ (1) آپؑ شیعہ اثنا عشریوں کے چھٹے اور اسماعیلیوں کے پانچویں امام ہیں۔ آپؑ نے تقریباً چونتیس سال امامت کی۔ آپؑ کی شہادت کے بعد آپ کے ماننے والے دو بنیادی فرقوں شیعہ اثنا عشریہ اور شیعہ اسماعیلیہ میں تقسیم ہوئے۔ شیعہ اثنا عشریہ کے مطابق حضرت جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے بیٹے موسیٰ کاظمؑ پر نص امامت کی تھی۔ جو حضرت امام جعفر صادقؑ کی شہادت کے وقت بقید حیات تھے۔

القمی اور النوبختی کے مطابق یہ فرقہ حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی رحلت کے فوراً بعد کچھ عرصہ کے لئے حضرت اسماعیل بن جعفر صادقؑ کی موت کا قطعی یقین رکھنے کی بناء پر فرقہ قطیعہ کے نام سے بھی موسوم رہا ہے۔ لیکن بارہ اماموں کے نظریہ کی بناء پر بعد میں شیعہ اثنا عشریہ سے ہی مشہور ہوا، جو اب صرف شیعہ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ جبکہ شیعہ اسماعیلی کے مطابق حضرت امام جعفر صادقؑ نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بجائے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل پر نص امامت کی تھی۔ جن کے حضرت جعفر صادقؑ کی شہادت کے وقت بقید حیات ہونے میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ حضرت اسماعیل کے نام سے منسوب ہو کر یہ لوگ شیعہ اسماعیلیہ کہلائے، جو اب صرف اسماعیلیہ (آغاخانی و بوہری) سے ہی مشہور ہیں۔ ''اسماعیلیہ کے چار فرقے (دور حاضر میں) موجود ہیں۔ قرامطہ بعض عرب ممالک بالخصوص بحرین و یمن میں بہت قلیل تعداد میں رہتے ہیں، جبکہ دروز فلسطین، شام اور یمن کے کچھ علاقوں میں بہت کم تعداد میں موجود ہیں۔ شیعہ اسماعیلیہ نزاریہ (آغاخانیہ) اور مستعالیہ (بوہری) دنیا کے بیس سے زیادہ ممالک میں لاکھوں کی تعداد میں بستے ہیں'' (2)

حضرت امام جعفر صادقؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد نے حضرت اسماعیل اور امام موسیٰ کاظمؑ کے بجائے حضرت محمد بن جعفر (جو الدیباج سے مشہور تھے) کی امامت کو قبول کیا۔ فرہاد دفتری کے مطابق ۲۰۰ھ جبکہ شیخ سعد اللہ القمی کے مطابق ۱۹۹ھ میں آپ نے عباسی خلیفہ المامون کے خلاف خروج کیا اور ناکام ہوئے۔ اس واقعے کے دو یا تین سال بعد آپ رحلت فرما گئے۔ کسی بھی

قدیم کتاب میں یہ نہیں ملتا ہے کہ الدیباج نے اپنی زندگی میں دعویٰ امامت کیا ہو۔ البتہ آپ کی رحلت کے بعد آپ کے مریدین میں سے ایک شخص یحیٰ بن ابی شمیط (السمط) نے آپ کی طرف امامت کو منسوب کیا اور اسی شخص کی نسبت سے مورخین نے اس کو فرقہ سمطیہ یا شمطیہ کا نام دیا ہے۔ بعد میں اس فرقے کی اکثریت نے حضرت عبداللہ افطح بن جعفر کی امامت کی طرف رجوع کیا۔

یاد رہے کہ بعض مورخین کے مطابق حضرت عبداللہ افطح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے اس لئے بعض لوگوں نے انہیں ہی اپنا امام تسلیم کیا تھا۔ لیکن بعد میں حضرت افطح اور ان کے ماننے والوں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت کی طرف رجوع کیا اور موسیٰ بن جعفرؑ کو اپنا امام تسلیم کیا۔ یہ نقطہ بھی قابل غور ہے کہ حضرت محمد الدیباج بن جعفر اور حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے ماں و باپ دونوں کی طرف سے سگے بھائی تھے، جبکہ حضرت عبداللہ افطح حضرت اسماعیل بن جعفر کے ماں و باپ کی طرف سے سگے بھائی تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت محمد الدیباج کی موت کے بعد آپ کے مریدوں کی قیادت حضرت اسماعیل کے حقیقی بھائی حضرت عبداللہ افطح بن جعفر نے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مریدین کی تعداد بھی سب سے زیادہ تھی۔ جیسا کہ فرہاد دفتری لکھتے ہیں۔ ”امام جعفر صادقؑ کے ماننے والوں کی اکثریت نے اب آپ کے بڑے بیٹے عبداللہ افطح کو اپنا نیا امام تسلیم کیا، جو امام اسماعیل کے سگے بھائی تھے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ عبداللہ اپنے والد سے نص ثانی حاصل کرنے کے مدعی تھے اور ان کے پیرو افطحیہ یا فطحیہ نے اس بارے میں امام صادقؑ سے ایک حدیث بھی نقل کی کہ امامت امام کے بڑے فرزند کے توسطّ سے منتقل ہوتی ہے۔

بہر حال عبداللہ جب اپنے والد کی وفات کے تقریباً ستر (۷۰) دن بعد فوت ہوئے تو ان کے حامیوں کی اکثریت موسیٰ بن جعفر کی طرفدار بنی“ (3) درحالانکہ حضرت عبداللہ اور ان کے سگے بھائی حضرت اسماعیل کی امامت میں بہت زیادہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت اسماعیل کی امامت کے لئے ان کے حامیوں نے جن دلائل کو ذکر کیا ہے، یہی دلائل حضرت عبداللہ کے لئے بھی ثابت تھے، کیونکہ حضرت عبداللہ کی والدہ حضرت حسن کی نسل سے امام زادی تھیں تو دوسری طرف قائم امام حضرت جعفر صادقؑ کی موجودگی میں بڑے بھائی (حضرت اسماعیل) کی رحلت کی وجہ سے خود بڑے بیٹے ہونے کا حق

بھی رکھتے تھے، کیونکہ اسماعیل کے بعد آپ ہی تمام بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ فرہاد دفتری کے مطابق فرقہ افطحیہ نے اپنے امام کی امامت میں ثانی الذکر دلیل کو ہی پیش کیا ہے۔

بہر حال صورت حال کچھ بھی ہو فرقہ افطحیہ اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکا اور منقرض ہو گیا۔ اس فرقے کی اکثریت نے اپنے امام حضرت عبداللہ افطح کی حیات یا ان کی وفات کے فوراً بعد حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کو قبول کیا۔ یہ فرقہ امامت کیلئے جو دلائل رکھتا تھا، ان میں سے اکثر دلائل حضرت اسماعیل پر صادق آتے تھے، جن کی بناء پر حضرت اسماعیل کی امامت کا دعویٰ کیا گیا تھا، لیکن فرقہ افطحیہ نے اپنے امام کے حقیقی بھائی کی امامت کو قبول کرنے کے بجائے حضرت موسیٰ بن جعفر کی امامت کو قبول کیا۔ ان عوامل سے حضرت موسیٰ بن جعفرؑ کی امامت کو تقویت ملتی ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت جعفر صادقؑ کے تمام بیٹوں نے دعویٰ امامت کیا تھا۔ ہماری تحقیق کے مطابق یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے چھ یا سات بیٹے تھے سب نے دعویٰ امامت نہیں کیا تھا۔ البتہ چار بیٹوں کی امامت کا تذکرہ ملتا ہے ان میں سے بھی صرف دو بیٹوں نے اپنی حیات میں جعفر صادقؑ کے نائب ہونے کا دعویٰ کیا ان میں ایک عبداللہ افطح تھا جس کا ذکر ہوا اور دوسرے حضرت موسیٰ کاظمؑ تھے جو جعفر صادقؑ کے جانشین بنے۔

جہاں تک حضرت اسماعیل بن جعفر اور حضرت محمد بن جعفر صادقؑ کی امامت کا تعلق ہے، تو ان دونوں نے امامت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ تاریخ میں ایسے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں کہ ان دونوں نے اپنی حیات میں دعویٰ امامت کیا ہو۔ ان کی امامت کا دعویٰ ان کی موت کے تقریباً سو سال بعد سامنے آیا ہے۔ مورخین اس پر متفق ہیں کہ حضرت محمد بن جعفر نے دعویٰ امامت نہیں کیا تھا، بلکہ بنو عباس کے خلاف اعلان بغاوت کی وجہ سے آپ کی موت کے بعد بعض لوگوں نے آپ کو امام تسلیم کیا، لیکن بہت جلد ان پر یہ بات عیاں ہوئی کہ امام جعفر صادقؑ کے حقیقی جانشین اور وقت کے امام حضرت موسیٰ کاظمؑ ہیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کی طرف رجوع کیا۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے امامت کے مورثی اصول وضع کئے تھے۔ آپؑ نے امامت کے اصولوں کو ایک ٹھوس بنیاد پر استوار کرنے کے بعد رحلت فرمائی تھی۔ لہٰذا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپؑ کی رحلت کے

فوراً بعد آپؑ کے تمام بیٹے امامت کا دعویٰ کریں۔ اور اگر یہ بات صحیح تسلیم کی جائے تو بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے صرف حضرت امام موسی کاظمؑ کی امامت کو محفوظ کرنے کیلئے دعویٰ امامت کیا تاکہ بنو عباس کے جاسوسوں کو اس کا ادراک نہ ہوسکے کہ جعفر کے بیٹوں میں سے کون جانشین امام ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو پورا احساس تھا کہ خلیفہ المنصور کی وجہ سے ان کے بابا کی شہادت ہوئی ہے۔ لہٰذا منصور عباسی کسی طور پر بھی حضرت امام جعفر صادقؑ کے نائب کو معاف نہیں کرے گا۔ اگر یہ بات تسلیم کی جائے کہ حضرت موسی کاظمؑ کا ہر ایک بھائی اپنے آپ کو اپنے بابا کا حقیقی جانشین سمجھتا تھا تو پھر ان میں سے اکثر بھائیوں نے اپنی حیات میں کیوں حضرت موسی کاظمؑ کی امامت کو قبول کیا۔

امام موسی کاظم علیہ السلام کے بھائیوں کی امامت کی نفی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت جعفر صادقؑ کے اکثر بڑے مشہور اور معروف شاگرد جن میں زرارہ بن اعیَن، ابو محمد ہشام بن الحکم، مومن الطاق، حماد بن عیسیٰ، ابو عبداللہ عبدالرحمٰن بن الحجاج البجلّی الکوفی، عبداللہ بن الکاہلی الکوفی، مفضل بن عمر الکوفی جعفی، یونس بن یعقوب الجبلی الدّہنی وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے شروع سے ہی حضرت موسی کاظمؑ کی امامت کو قبول کیا تھا۔ شیخ مفید لکھتے ہیں۔ ''حضرت امام جعفر صادقؑ کے بڑے بڑے صحابہ، آپؑ کے خاص رازدان لوگوں اور قابل وثوق فقہاء صالحین رحمۃ اللہ علیہم میں جنہوں نے آپ سے اپنے بیٹے اور ابوالحسن موسی کاظمؑ کی امامت پر نص قائم کی ہے، وہ مفضل بن عمر جعفی، معاذ بن کثیر، عبدالرحمٰن بن حجاج، فیض بن مختار، یعقوب سراج، سلیمان بن خالد، صفوان جمال وغیرہ ہیں'' (4)

حضرت امام جعفر صادقؑ کے تمام بیٹوں کے دعویٰ امامت کو ثابت کرنا مشکل ہے۔ اس پر تاریخی شواہد کے تناظر میں کافی تبصرہ کرنے کی گنجائش ہے، لیکن یہ ہمارے موضوع سے مربوط نہیں ہے۔ بس اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ قدیم مواد یہ بتاتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے بیٹوں حضرت اسحاق اور حضرت علی اور اصحاب کی اکثریت نے حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کو قبول کیا تھا۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کے جانشین پر اتنا بڑا اختلاف کیوں پیدا ہوا، جبکہ شیعہ اسماعیلی اور اثنا عشری دونوں کے نزدیک امامت کا قیام بذریعہ نص سے ہونا ثابت ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے بھی اس پر زور دیا ہے کہ امامت ایک خاص مذہبی علم پر مبنی ہے اور اس علم کی بنیاد پر ائمہ منصوص من اللہ ہوتے

ہیں اور سابق امام بذریعہ نص امامت کو آئندہ امام کی طرف منتقل کرتا ہے۔ یقیناً حضرت اسماعیل حضرت موسیٰ کاظمؑ سے سے بڑے تھے اور ساتھ ہی ان کی والدہ ماجدہ امام زادی بھی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے والد انہیں بہت زیادہ اکرام اور تعظیم بھی دیتے تھے۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے بض لوگوں نے انہیں حضرت امام جعفر صادقؑ کا جانشین تصور کیا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سب باتیں امامت کی خصوصیات اور علامات کے طور پر ثابت ہیں، لیکن نص امامت میں یہ باتیں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے ان خصوصیات کو دلائل منصوصہ پر محمول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر حضرت اسماعیل کی وفات کا اقرار کیا جائے تو پھر بات اور زیادہ آسان ہو جاتی ہے، کیونکہ اکثر مآخذ کے مطابق حضرت اسماعیل اپنے والد سے قبل وفات پاگئے تھے۔ شیعہ اثنا عشری حضرت اسماعیل کی نیک سیرت کے بھی قائل ہیں۔ اکثر اثنا عشری علماء نے آپ کی مدح سرائی کی ہے۔ البتہ صرف ایک روایت ایسی بھی نقل کی گئی ہے، جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیل نے شراب نوشی کی تھی جس کی وجہ سے درجہ عصمت میں نہیں رہے تو ان پر نص امامت بھی نہیں ہو سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ روایت من گھڑت اور جھوٹ پر مبنی ہے، کیونکہ حضرت اسماعیل کی سیرت کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کہ کوئی بھی غیر شرعی فعل کو آپ سے منسوب کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو پھر صرف ایک ہی روایت کیوں ہوتی، بلکہ متعدد روایات اس مسئلے میں موجود ہوتیں اور آپ کی سیرت کے دیگر پہلوؤں میں بھی خامیاں سامنے آتیں۔ تاریخ میں ایسی کوئی بات درج نہیں ہوئی ہے جس سے حضرت اسماعیل کا نقص سامنے آتا ہو۔ نیز ان کی تربیت حضرت امام جعفر صادقؑ نے خود کی ہے۔

اس روایت کو علامہ مجلسی سے منسوب کرتے ہوئے ڈاکٹر زاہد علی لکھتے ہیں۔ ''علّامہ مجلسی نے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اسماعیل کو اپنا جانشین بنایا تھا، لیکن ایک موقع پر وہ خلاف شرع عمل کے مرتکب ہوئے۔ یہ دیکھ کر ان کے والد برافروختہ ہوئے اور امامت کا عہدہ موسی کاظمؑ کی طرف منتقل کر دیا۔'' (5) لیکن دوسری طرف علماء نے اس روایت کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے

کہ حضرت اسماعیل ایک نیک سیرت اور پرہیزگاری کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ لہٰذا منتقلی امامت کے حوالے سے حضرت اسماعیل کی سیرت کو وجہ بنانا صحیح نہیں ہے۔ اصل بحث یہ ہے کہ نص امامت حضرت اسماعیل پر ہوئی تھی یا نہیں۔

اکثر مورخین نے نص امامت کو حضرت اسماعیل سے حضرت موسی کاظمؑ کی طرف منتقل ہونے کی ایک اہم وجہ جعفر صادقؑ کی حیات میں ہی حضرت اسماعیل کی وفات بتاتے ہیں، جبکہ شیعہ اسماعیلیہ کے جدید مآخذات اس وجہ کی تائید نہیں کرتے ہیں۔ ''کچھ روایات میں حضرت امام اسماعیل کی نص امامت کو موسیٰ کاظمؑ پر بدلنے کا سبب ان کی باپ کی حیات میں وفات بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ان کے جنازے میں شامل لوگوں کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ جہاں تک جنازے کے قصّے کا تعلق ہے ڈاکٹر ''ایوانف'' کا کہنا ہے کہ یہ قصّہ کسی نے پہلے سے تیار کیا ہوگا اور امام اسماعیل کے متعلق زیادہ اطلاعات نہ ہونے کی بناء پر لوگوں میں یہ قصہ مشہور ہوگیا۔'' (6)

ایوانف نے حضرت اسماعیل کی موت کی روایت جعلی ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے، لیکن اس پر وہ کوئی حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں، کیونکہ اس حوالے سے ائمہ اہل بیت (اسماعیلیہ) سے منسوب کوئی ایک روایت بھی نہیں ملتی ہے۔ اس لئے کسی بھی مورخ اور محقق کے لئے حضرت اسماعیل بن جعفر کی موت آپ کے والد کی حیات میں ہونے کی نفی کرنا بہت مشکل ہے، لیکن اس کا احتمال ضرور پایا جاتا ہے۔ اس احتمال کو عقلی دلیل سے تقویت مل سکتی ہے کہ جس طرح سے حضرت امام جعفر صادقؑ نے حضرت اسماعیل کی تجہیز و تکفین کا غیر رسمی انداز میں انتظام کیا ہے، یہ غیر رسمی انتظام ظاہر کرتا ہے کہ امام اپنے فرزند کو بنو عباس کے جابر وظالم حکمرانوں سے بچانا چاہتے ہوں۔

بہر حال اگر قصّہ جعلی بھی سمجھا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے حضرت اسماعیل کو تقیہ میں بھیجا تھا اور حضرت اسماعیل بن جعفر کی موت اپنے والد کی حیات میں نہیں ہوئی تھی تو بھی صورت حال واضح نہیں ہوتی ہے کیونکہ موجودہ اسماعیلیہ کا تعلق اسماعیلیہ مبارکیہ سے ہے۔ قدیم اسماعیلیہ کے دو فرقے گزرے ہیں ایک فرقہ حضرت اسماعیل کی موت حضرت جعفر صادقؑ کی حیات میں

ہونے کے قائل رہا، جنہیں اسماعیلیہ مبارکیہ کہا جاتا ہے جبکہ دوسرا فرقہ جنہیں اسماعیلیہ خالصہ کہا جاتا ہے جو حضرت اسماعیل کی موت حضرت جعفر صادقؑ کی حیات میں ہونے سے منکر رہا ہے۔

ڈاکٹر عزیز اللہ نجیب (ایک معروف اسماعیلی نزاری عالم) اس مسئلے کو کسی حد تک سلجھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک ہے کہ موجودہ مذہب اسماعیلیہ کا تعلق ان قدیم اسماعیلیوں سے ہے، جنہوں نے حضرت اسماعیل کی موت حضرت جعفر صادقؑ کی حیات میں ہونے کا اقرار کیا لیکن خود قدیم اسماعیلیہ مبارکیہ میں قلیل تعداد میں کچھ اسماعیلی حضرات ایسے بھی تھے، جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت اسماعیل کی موت حضرت جعفر صادقؑ کی حیات کے بعد ہوئی ہے۔

موجودہ اسماعیلیہ کا تعلق انہیں لوگوں میں سے ہے۔ یقیناً ڈاکٹر عزیز اللہ نجیب اس طرح اس اہم مسئلے کا ایک حل نکالنے میں کامیاب ضرور ہوئے ہیں، لیکن قدیم تاریخی مواد میں اس کی تائید نہیں ملتی ہے۔ کیونکہ مبارکیہ کے بھی دو فرقے قرامطہ اور میمونہ کے نام سے بنے تھے اور دونوں فرقے حضرت اسماعیل کی موت اپنے باپ کی حیات میں ہونے کے قائل تھے۔ قدیم مواد میں کہیں ایسا نہیں ملتا ہے کہ میمونہ اور قرامطہ میں کوئی ایسا گروہ بھی موجود تھا جو حضرت اسماعیل کی موت حضرت جعفر صادقؑ کی حیات میں ہونے کا منکر تھا، یقیناً ایسے لوگ تھے لیکن ان کا تعلق فرقہ مبارکیہ سے نہیں، بلکہ فرقہ خالصہ سے تھا یا خود بنو عباس سے تھا۔ جیسا کہ دور حاضر کے معروف محقق ہاشم معروف لکھتے ہیں۔ ”اس کے باوجود کچھ شیعہ ان (اسماعیل) کی امامت کے قائل ہوگئے اور پھر منصور نے اس نظریہ کی تائید کی اور یہ خبر مشہور کردی کہ بصرہ کے گورنر نے اطلاع دی ہے کہ اسماعیل وہاں موجود ہیں“ (7)

بہر حال حضرت محمد بن اسماعیل کے حامیوں نے آپ کی امامت کو تسلیم کیا تھا، لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ حضرت اسماعیل نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی اشارہ فرمایا ہو کہ میں اپنے بابا کا قائم مقام بنوں گا یا حضرت جعفر صادقؑ کے شیعوں میں سے کسی نے حضرت اسماعیل کی حیات میں یا آپ کی رحلت کے فوراً بعد آپ کی امامت کا دعویٰ کیا تھا۔ مندرجہ بالا تمام باتوں کو تاریخی طور پر ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اکثر قدیم مورخین اور دور حاضر کے تاریخ اسماعیلیہ کے ماہر مورخ فرہاد دفتری کے مطابق تیسری صدی کے وسط سے پہلے موجودہ اسماعیلیہ مذہب کے عقائد اور نظریات کو

ثابت کرنا محال ہے۔ کیونکہ تیسری صدی کے وسط سے پہلے حضرت اسماعیل کی امامت کا دعویٰ کرنے والا کوئی قابل ذکر گروہ سامنے نہیں آیا تھا۔

صورت حال کچھ بھی ہو" موجودہ اسماعیلیہ کے نظریے کے مطابق حضرت امام جعفر صادقؑ کے بعد حضرت اسماعیل اور ان کے جانشین اماموں نے عباسی خلفاء کے اہل بیت پر ظلم و ستم کی وجہ سے نہایت ہی خفیہ طور پر زندگی بسر کی، یہ دور اسماعیلی تاریخ میں " دور ستر " کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دور حضرت امام اسماعیل سے شروع ہوتا ہے اور گیارہویں امام حضرت مہدی کے ظہور پر ختم ہوتا ہے۔۔۔ یمن میں اسماعیلی داعی ابن حوشب ( منصور یمن ) کے ہاتھوں اسماعیلی حکومت قائم ہوئی اور حضرت ابو عبداللہ الشیعی نے شمالی افریقہ ( مغرب ) میں ۲۹۷ھ ( ۹۰۹ء ) میں فاطمی خلافت کی بنیاد رکھی۔ حضرت اسماعیل نے دس سال تک امامت کے امور سرانجام دینے کے بعد ۱۵۸ھ ( ۷۷۵ء ) میں وفات پائی اور سلمیہ میں دفن ہوئے اور نص کے مطابق آپ کے فرزند حضرت امام محمد مسند امامت پر جلوہ افروز ہوئے" (8)

شیعہ اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ میں سب سے اہم مسئلہ اور بحث حضرت اسماعیل کی وفات کے ان کے والد حضرت امام جعفر صادقؑ کی حیات میں ہونے کے حوالے سے ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ حضرت اسماعیل کی وفات ان کے والد کی حیات میں ہوئی ہے تو پھر حضرت اسماعیل کی امامت کو ثابت کرنا مشکل ہے اور اگر حضرت اسماعیل کی وفات اپنے والد کی وفات کے بعد ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اسماعیل کی امامت کے دلائل کا تقابل ان کے چھوٹے بھائی حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کے دلائل سے کیا جاسکتا ہے تاکہ ان دونوں بھائیوں میں اپنے والد کے صحیح جانشین کی تشخیص ہوسکے۔

موجودہ اسماعیلی حضرت اسماعیل کی موت حضرت جعفر صادقؑ کی رحلت کے دس سال بعد ہونے کے قائل ہیں۔ اگر حضرت اسماعیل اپنے والد کی رحلت کے بعد حیات رہے تو اس صورت میں جعفر صادقؑ کی طرف سے نص امامت حضرت محمد بن اسماعیل کیلئے ثابت کرنا مشکل ہوگا۔ یاد رہے کہ اسماعیلیہ کا ایک قدیم ترین فرقہ قرامطہ ہے جو حضرت محمد بن اسماعیل کو حضرت جعفر صادقؑ کا قائم مقام امام مانتے ہیں اور حضرت اسماعیل کی امامت کی نفی کرتے ہیں جبکہ موجودہ اسماعیلی ان دونوں کی امامت کے قائل ہیں۔

اگر امام جعفر صادقؑ کے بعد آپ کے بڑے فرزند حیات تھے تو پھر حضرت جعفر صادقؑ اپنے قائم مقام (یعنی اپنے بیٹے حضرت اسماعیل) پر نص کریں گے نہ کہ حضرت اسماعیل کے قائم مقام (یعنی اپنے پوتے حضرت محمد) پر نص کریں گے۔ جبکہ قدیم اسماعیلی حضرت جعفر صادقؑ کی طرف سے نص امامت حضرت محمد بن اسماعیل پر ہونے کے قائل نظر آتے ہیں۔

بعض اسماعیلی مورخین کا یہ کہنا ہے کہ حضرت اسماعیل کا انتقال اپنے والد کی حیات میں ہوا تھا، لیکن چونکہ والد نے ان پر نص امامت کی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نص ان کی اولاد میں باقی رہی۔ جیسا کہ موسیٰؑ پیغمبر نے ہارونؑ پر نص کی تھی، لیکن ہارونؑ خود موسیٰؑ کی حیات میں انتقال فرما گئے تھے۔ اسی طرح اسماعیل بن جعفر منصوص امام تھے، لیکن والد کی حیات میں انتقال فرما گئے اور انہوں نے رحلت سے پہلے اپنے بیٹے محمد پر نص امامت کی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اسماعیل کی تاریخ وفات میں مورخین میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ شیخ دیدار علی آپ کی تاریخ وفات ۱۵۸ھ لکھتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر زاہد علی اپنی مشہور کتاب ''تاریخ فاطمین مصر'' میں حضرت اسماعیل کی تاریخ وفات ۱۳۳ھ لکھتے ہیں۔

بہر حال اکثر قدیم مواد یہی بتاتا ہے کہ حضرت اسماعیل کی وفات اپنے والد کی حیات میں ہوئی تھی۔ اس کی تائید کچھ اس طرح بھی ہوتی ہے کہ محمد بن اسماعیل کو ان کے دادا حضرت جعفر صادقؑ نے چھپایا تھا یقیناً یہ کام باپ کی عدم موجودگی میں دادا ہی کر سکتا ہے، لیکن دوسری طرف ایک اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل نے اپنے فرزند حضرت محمد پر نص امامت کی تھی لیکن یہ کیسے ممکن ہے جبکہ قائم امام حضرت جعفر صادقؑ خود موجود ہوں۔ قائم کی موجودگی میں حضرت اسماعیل کس طرح اپنے بیٹے کی امامت کا اعلان کر سکتے ہیں۔

پیغمبر ہارونؑ اور موسیٰؑ کی دلیل بھی اس کو ثابت کرنے میں کافی نہیں ہے، کیونکہ جب حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ پر نص پیغمبری کی تھی تو اس وقت حضرت موسیٰؑ خود (قائم) پیغمبر تھے۔ جبکہ حضرت اسماعیل کے انتقال کے وقت حضرت جعفر صادقؑ خود قائم امام کے طور پر موجود تھے تو پھر حضرت اسماعیل کی نص امامت اپنے فرزند حضرت محمد بن اسماعیل کے لئے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی دلیل سے

ثابت کرنا کافی مشکل ہے۔ لیکن اگر حضرت اسماعیل کی رحلت کی تاریخ شیخ دیدار علی کی صحیح مان لی جائے تو مشکل یہ پیش آتی ہے کہ حضرت جعفر صادقؑ کے بعد امام حضرت اسماعیل حیات تھے تو پھر حضرت جعفر صادقؑ کو اپنے پوتوں کو تقیہ میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ آپ کے بعد ان کو امام ہی نہیں بننا تھا، کیونکہ آپ کو نص امامت اپنے سب سے بڑے بیٹے اسماعیل پر ہی کرنی تھی نہ کہ پوتوں پر۔ بہر حال حضرت امام جعفر صادقؑ کے بعد آپ کے سب سے بڑے فرزند حضرت اسماعیل اور ان کے فرزند حضرت محمد کی امامت کو تاریخ کے بنیادی مواد کے تناظر میں سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جب تک ان دونوں کی امامت کو نہ سمجھا جائے، مذہب اسماعیلیہ کو سمجھنا محال اور مشکل ہے۔

جبکہ دوسری طرف حضرت امام جعفر صادقؑ کی رحلت کے ساتھ ہی ان کے پیروکار حضرت امام جعفر صادقؑ کے عمر کے لحاظ سے تیسرے بیٹے حضرت امام موسی کاظمؑ کی امامت کے قائل ہوئے۔ اکثر قدیم تاریخی مواد کے جائزہ سے حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ حضرت موسی کاظمؑ کی امامت پر قدیم اور جدید دونوں مآخذ میں متعدد روایات اور نصوص کو بیان کیا جاتا ہے۔ ان روایات کو حضرت امام جعفر صادقؑ کے اصحاب اور شیوخ نے نقل کیا ہے۔ جن میں المفضل بن عمر الجعفی، معاذ بن کثیر، عبدالرحمٰن ابن الحجاج، الفیض بن المختار، یعقوب بن خالد، صفوان الجمال، یزید بن سلیط، داود بن کثیر، ابراہیم کرخی، عیسیٰ علوی، سلیمان بن خالد اور زرارہ بن اعین وغیرہ شامل ہیں۔ جنہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے امام موسی کاظم علیہ السلام کی امامت پر نصوص کو نقل کیا ہے۔

مندرجہ بالا سب کے سب شیعہ فقہاء، ثقات اور محدثین تھے اور ان میں سے کچھ حضرت امام جعفر صادقؑ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے دو فرزند حضرت اسحاق اور حضرت علی نے نہ صرف اپنے بھائی کی امامت کو تسلیم کیا بلکہ اپنے باپ حضرت امام جعفر صادقؑ سے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت میں متعدد روایات کو بھی نقل کی ہیں۔

طوالت کے خوف سے ان تمام حضرات کے نصوص کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ ان روایتوں کو شیعہ علماء اکثر ائمہ کی سیرت پر مبنی کتب میں نقل کرتے ہیں۔ ان کتب میں ایک قدیم کتاب ''کشف الغمة فی معرفة الائمّة'' ہے، جس کو ابی الحسن علی بن عیسی بن ابی الفتح الِاربلی (المتوفی ۶۹۳ھ) نے تالیف کیا ہے۔

اس کتاب کے جلد سوئم میں ان تمام روایتوں کو جمع کیا گیا۔ اسی طرح شیخ مفید نے اپنی کتاب ''الارشاد''میں تقریباً ۱۲ روایتوں کو نقل کیا ہے اور ساتھ ہی موسیٰ کاظمؑ کی امامت کے دلائل کے طور پر آپ کے معجزات اور کرمات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

علاوہ ازیں شیعہ اثنا عشریہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت پر ان احادیث سے بھی استفادہ کرتے ہیں، جن میں حضرت محمد ﷺ نے ائمہ کی تعداد بیان کی ہے اور بعض احادیث میں بارہ ائمہ کے نام بھی بیان کئے ہیں۔ ان احادیث کو شیعہ و سنی محدثین نے اکثر سیرت اور احادیث کی بنیادی کتب میں نقل کیا ہے۔ بارہ خلفاء کے وجود کے بارے میں دلالت کرنے والی حدیثیں اہل سنت کی معتبر ترین صحاح میں بھی ذکر ہوئی ہیں۔ صحیح بخاری ۹ ۔۸۱، باب الاستخلاف، صحیح مسلم، ۶۔۳ کتاب الامارہ، مسند احمد ۵۔۱۰۸، ۵۶، مستدرک حاکم: ۳۔۱۸ میں بارہ خلفاء والی احادیث کو دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ سوال بدیہی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اگر امام جعفر صادقؑ نے حضرت موسیٰ کاظمؑ پر نص امامت کی تھی تو پھر امامت کے حوالے سے اتنا اختلاف کیوں پیدا ہوا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کی حیات میں اس طرح کے اختلافات بالکل بھی سامنے نہیں آئے تھے بلکہ آپؑ کی شہادت کے بعد اس طرح کے اختلافات تاریخ میں نمودار ہوئے جس میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کی اپنی حیات میں آپؑ کے کسی ایک فرزند نے بھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ آپؑ کی شہادت کے بعد بھی کئی سالوں تک کسی نے امامت کا دعویٰ کیا تھا۔

جہاں تک رہی بات کہ امام جعفر صادقؑ نے حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کو واضح طور پر بیان کیوں نہیں کیا تو یہ بات عیاں ہے کہ اپنے اصحاب اور خواص کے پاس متعدد بار حضرت موسیٰ کاظمؑ پر نص امامت کی ہے تب ہی تو آپؑ کے تمام اصحاب نے حضرت موسیٰ کاظمؑ کی امامت کی طرف رجوع کیا اور انہیں اپنا امام تسلیم کیا۔ البتہ عوامی سطح پر حضرت امام موسیٰؑ کی امامت پر برملا اظہار سے آپ گریزاں رہتے تھے اس کی بنیادی وجہ ''آپ (جعفر صادقؑ) پر برسر اقتدار حکومت کی شب و روز پر سخت نگاہ تھی جیسا کہ آپ کے ساتھ منصور کے طرز عمل سے ظاہر ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے خلیفہ منصور اور اس کے

اعمال کے خوف سے اپنے شرعی جانشین کے نام کو اپنے خاص اصحاب کے علاوہ دوسرے عام لوگوں سے پوشیدہ رکھا تھا" (9)

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اصحاب اور خواص کے پاس اپنے فرزند حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کو صراحت سے بیان کیا جس کی وجہ سے دور صادقین کے تمام فقہاء اور علماء اور شاگردان حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ سب نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت پر روایات کو نقل کیا ہے اور ان کی امامت کو تسلیم کیا ہے۔

*****

# حوالہ جات

1۔ہاشم معروف، سیرت ائمہ اہل بیت، ص ۲۴۸ ج ۲، مترجم سید علی رضا، طبع اول ۱۹۹۶ء، جامعہ تعلیمات اسلامی، کراچی پاکستان

2۔استوری، ڈاکٹر سجاد علی، نص امامت، ص ۲۳۸، ناشر اسلامک پبلی کیشنز جیوانی گارڈن سولجر بازار کراچی سن اشاعت ۲۰۱۲

3۔فرہاد دفتری، اسماعیلی تاریخ اور عقائد، ص ۱۰۰، ۹۹، ج اول، ایس ایک پریس پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی سن اشاعت ۲۰۰۴ء

4۔شیخ مفید، کتاب الارشاد (تذکرۃ الاطہار) ص ۳۷۷

5۔زاہد علی ڈاکٹر، تاریخ فاطمین مصر، ج ۱، ص ۴۱ بحوالہ بحار الانوار ج ۱۱، ص ۱۷۹

6۔دیدار علی شیخ، تاریخ ائمہ اسماعیلیہ، ج ۱، ص ۱۵۶، شیعہ امامیہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن گارڈن ایسٹ کراچی سن اشاعت ۱۹۹۰ء

7۔ حسنی، ہاشم معروف، سیرت ائمہ اہل بیت، ص۔۔۔ ج ۲

8۔تاریخ ائمہ اسماعیلیہ، ج ۱، ص ۱۵۵، ۱۵۴

9۔ہاشم معروف، سیرت اہل بیت، ص۔۔۔ ج ۲

# حضرت زیدؑ شہید کے قیام کے اسباب

(ایک تحقیقی جائزہ)

ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی*
dr.sha.wasti@gmail.com

**کلیدی کلمات:** حجاج بن یوسف، خالد قسری، ہشام بن عبدالملک، واقعہ کربلا، بنی امیہ، بنی ہاشم

## خلاصہ

واقعہ کربلا کے بعد بنو ہاشم کی طرف سے بنو اُمیہ کے خلاف ایک اور بڑا معرکہ تاریخ کے اُفق پر نظر آتا ہے جسے قیام حضرت زید شہیدؒ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس مقالے میں حضرت زید شہید کے قیام کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور اُن اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی بناء پر حضرت زید شہیدؒ نے اُموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے خلاف تحریک چلائی۔ اس تحریک سے بنو اُمیہ کے خلاف چلنے والی انقلابی تحریکوں کو حوصلہ ملا اور اُموی دورِ حکومت کا خاتمہ ہوا۔
امویوں نے بنو ہاشم کو اپنی حکومت کے خلاف قیام سے روکنے کے لیے حضرت زید شہید کے قیام کی مخالفت میں ایسی احادیث وضع کرائیں جن کے سبب آج تک لوگوں کے اذہان میں حضرت زید شہیدؒ کے قیام سے متعلق شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ حضرت زید شہیدؒ نے کسی موقع پر حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ کی حکم عدولی نہیں کی اور نہ ہی کبھی اُنہوں نے امامت کا دعوی کیا بلکہ یہ اموی حکمرانوں کی جانب سے کیا ہوا پروپیگنڈا تھا، جسے اُنہوں نے لوگوں کو اُن سے دور کرنے کے لیے کیا حالانکہ حضرت زید شہیدؒ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے مخفی طور پر اِذن یافتہ تھے۔

*۔ پی۔ایچ۔ڈی

بنو اُمیہ کا دورِ حکومت جو فسق وفجور اور ظُلم و جور کے باعث مسلمانوں کی تاریخ کا سیاہ دور جانا جاتا ہے۔ بنو اُمیہ نے اپنے فسق وفجور اور ظُلم وجور کے واقعات پر پردہ ڈالنے کے لیے اور اپنے خلاف اُٹھنے والی تحریکوں کو بدنام کرنے کے لیے اُن کے خلاف اپنی ریاستی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے پروپیگنڈا کرایا اور تواریخ میں جھوٹے واقعات نقل کرائے تاکہ آنے والی نسلیں اُن سے نفرت یا بیزاری نہ کریں۔ واقعہ کربلا کے عظیم سانحہ کے بعد بنو ہاشم کے طرف سے بنو اُمیہ کے خلاف ایک اور بڑا معرکہ تاریخ کے اُفق پر نظر آتا ہے جسے قیام حضرت زید شہید علیہ السلام کا نام دیا جاتا ہے۔

اس مقالے میں حضرت زید شہید کے قیام کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور اُن اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کی بناء پر حضرت زید شہید علیہ السلام نے اپنی افرادی قوت کم ہونے کے باوجود اُموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے خلاف تحریک چلائی اور قیام کیا، جس سے لوگوں میں بیداری پیدا ہوئی اور اس کے ثمرات کے طور پر بنو اُمیہ کے خلاف چلنے والی انقلابی تحریکوں کو حوصلہ ملا اور اُموی دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت زید شہید علیہ السلام نے اپنے دادا حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے اُسی طرز پر قیام کیا، جس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام نے ۶۱ھ میں یزید بن معاویہ کے فسق وفجور کے خلاف قیام کیا تھا اور ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کو کربلا کے مقام پر شہادت پائی۔ یزید ملعون نے اپنی فتح کا جشن منایا اور اہلبیت علیہ السلام کی توہین کرتے ہوئے بھرے دربار میں شراب کے نشہ میں واقعہ کربلا کے پس پردہ اپنے اصل محرکات بیان کر دیئے۔ یزید ملعون کی اسلام دشمنی اُس وقت مکمل طور پر عیاں ہو گئی، جب اُس نے جنگ بدر میں قتل ہونے والے اپنے بزرگوں جو کہ کافر اور مشرک تھے، کا ذکر اشعار میں اس انداز سے کیا: (1)

لَيْتَ أَشْيَاخِي بِبَدْرٍ شهيدوا　　جَزَعَ الْخَزْرَجِ فِي وَقْعِ الْأَسَلْ

فَأَهَلُّوا وَاسْتَهَلُّوا فَرَحًا　　ثُمَّ قَالُوا لِي هنيا لا تسلْ

کاش میرے وہ بزرگ جو جنگ بدر میں مارے گئے اس وقت موجود ہوتے اور دیکھتے کہ قبیلہ خزرج تلواروں کے پڑنے سے کس طرح چیخ اُٹھا ہے، یقیناً یہ دیکھ کر وہ خوشی سے چلّا اُٹھتے۔

لست من خندف إن لم أنتقم　　من بني أحمد ما كان فعل

میں خندف سے نہ ہوں گا اگر احمدؐ کے عمل کا اُن کی اولاد سے انتقام نہ لو۔

فجزیناھم ببدر مثلھا　　وأقمنا مثل بدر فاعتدل

ہم نے ان کو جنگِ بدر کا بدلہ دیا ہے، اب دونوں برابر ہو گئے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے بہیمانہ قتل اور یزید ملعون کے فسق و فجور سے آگاہی کے بعد اہل مدینہ نے یزید کی حکومت کے خلاف بغاوت کی تو یزید ملعون نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے مسلم بن عقبہ کی سالاری میں شامی فوج مدینہ منورہ بھیجی۔ اس فوج میں بڑی تعداد میں عیسائی شامل تھے۔ اس شامی فوج نے یزید ملعون کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مدینہ منورہ پر حملہ کیا اور وہاں بے رحمی کے ساتھ مدینہ منورہ میں مقیم تابعین اور صحابہ کرام کے خون سے ہولی کھیلی۔ یہ واقعہ ماہ صفر المظفر ۶۳ھ میں پیش آیا، جسے واقعہ حرّہ کہا جاتا ہے۔ شامی فوج نے صحابہ کرام کا بے دریغ قتلِ عام کرنے کے علاوہ اُن کی مستورات کی عصمت دری کی اور ظلم کی انتہاء کر دی (2)۔

واقعہ حرّہ کے سانحہ کے بعد مسلم بن عقبہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا، لیکن وہ مکہ پہنچنے سے قبل حصین بن نمیر کو اپنا قائم مقام مقرر کرکے مر گیا۔ حصین بن نمیر نے مکہ کا محاصرہ کرکے منجنیقوں سے خانہ کعبہ پر آگ اور پتھر برسائے، جس سے پورا شہر دھویں کی لپیٹ میں آگیا۔ اسی اثناء میں ماہ ربیع الاول ۶۴ھ میں یزید کی موت واقع ہو گئی۔ علامہ سیوطی بیان کرتے ہیں کہ جب یزید کی موت کی خبر عبداللہ بن زبیر کو ملی تو اس نے پکار کر کہا:

" یا أھل الشام ان طاغیتکم قد ھلك فانقلوا و ذلوا و تخطفھم الناس "

"اے شامیو! تمہیں گمراہ کرنے والا مر گیا۔"

جب یہ خبر شامی لشکر نے سُنی تو شامی لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور اس نے سخت ذِلّت اُٹھائی اور لوگوں نے لشکر کا تعاقب کیا اور جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا (3)۔ دیگر مورخین جیسے طبری، ابن اثیر، ابن کثیر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ ملک میں چاروں طرف انارکی اور بغاوت پھیل گئی جبکہ شامی فوج خوفزدہ ہو کر اُلٹے پاؤں بھاگنے کی راہ تلاش کر رہی تھی، جس کے سبب عبداللہ بن زبیر اور حصین بن نمیر کے درمیان جنگ بندی کے لیے گفت و شنید ہوئی جس کے نتیجے میں ماہ ربیع الاول ۶۴ھ میں جنگ بند ہوئی (4)۔

یزید بن معاویہ کی موت کے بعد مروان بن حکم نے اپنی مکاری سے اقتدار کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لی اور پھر سے ظلم وجور کا بازار گرم کر دیا(5)۔

مروان کے دور اقتدار میں اہل عراق متحرک ہوگئے اور ان میں سے ایک گروہ نے ۲۲ جمادی الاول ۶۵ھ میں سلیمان بن صرو خزاعی کی قیادت میں خونِ حضرت امام حسین علیہ السلام کا بدلہ لینے کا نعرہ بلند کیا۔ مورخین نے اس گروہ کو توابین کا نام دیا ہے۔ اس گروہ کے افراد نے شامی فوج کے مقابلے میں اپنی افرادی قوت کم ہونے کے باوجود دلیری سے کئی روز تک جنگ لڑی، لیکن اُنہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور وہ تمام لوگ شامی فوج سے لڑتے ہوئے قتل ہو گئے۔ اہل کوفہ نے جدو جہد جاری رکھی اور ایک بار پھر محرم الحرام ۶۶ھ میں حضرت مختار ثقفیؒ کی قیادت میں اُٹھے اور اس بار کوفہ میں حضرت مختار ثقفیؒ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت مختار ثقفیؒ نے عراق میں موجود حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاتلوں کو گرفتار کرکے کیفر کردار تک پہنچایا۔ حضرت مختار ثقفیؒ نے بنو اُمیہ کے خلاف کئی جنگیں لڑیں اور ان میں کامیابی حاصل کی۔ عبداللہ بن زبیر کی حجاز میں حکومت قائم تھی، حضرت مختار ثقفیؒ کی پے در پے کامیابیوں سے خائف ہوا کہ حضرت مختار ثقفیؒ مستقبل میں اس کے مد مقابل آئیں گے لہٰذا عبداللہ بن زبیر نے اپنے بھائی مصعب بن زبیر کو ان کے مقابل لا کھڑا کیا، جس نے اہل عراق سے خفیہ رابطے کرکے انہیں انعام واکرام دے کر اپنے ساتھ ملا لیا، جس سے حضرت مختار ثقفیؒ کی جمعیت درہم برہم ہو گئی۔

حضرت مختار ثقفیؒ نے اپنے مختصر ساتھیوں کے ہمراہ مصعب بن زبیر سے جنگ لڑی تو وہ اہل عراق کے غدر کے سبب ۱۴ار مضان المبارک ۶۷ھ بمطابق ۳ اپریل ۶۸۷ء کو مصعب بن الزبیر کے ہاتھوں شہید ہوگئے (6)۔ اس طرح عبداللہ بن زبیر کی حکومت حجاز سے لے کر عراق تک وسیع ہو گئی۔ دوسری طرف مروان بن حکم کی موت واقع ہونے پر عبدالملک بن مروان نے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس نے سب سے پہلے عراق پر اپنے تسلط قائم کرنے کے لیے حجاج بن یوسف کے ذریعہ مصعب بن زبیر کے ساتھ وہی چال چلی، جو مصعب بن زبیر نے حضرت مختار ثقفیؒ کے ساتھ چلی تھی اور اہل عراق کو انعام واکرام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

اس کے بعد حجاج بن یوسف نے مصعب بن زبیر کو ایک خونریز جنگ کے بعد قتل کر دیا۔ عبدالملک بن مروان کوفہ کے قریب حیرہ پہنچا، جہاں حجاج بن یوسف نے اہل عراق کی عبدالملک بن مروان کے ہاتھ پر بیعت کروائی۔ عراق پر عبدالملک بن مروان کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد حجاج بن یوسف عبد الملک کے حکم پر عبداللہ بن زبیر کی حجاز میں قائم حکومت کے خاتمہ کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوا۔

حجاج بن یوسف نے مکہ معظّمہ کا محاصر کرکے منجنیقوں سے آگ اور پتھر برسائے اور اس محاصرے کے سبب اُس سال لوگوں کے لیے حج کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ عبداللہ بن زبیر نے حجاج بن یوسف کا سخت مقابلہ کیا مگر کئی ماہ کی لشکر کشی کے باعث بالآخر حجاج بن یوسف، عبداللہ بن زبیر کو قتل کرکے مکہ مکرمہ میں اُن کی حکومت کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ حجاج بن یوسف کی قتل و غارت گری کے نتیجہ کے طور پر حجاز بھی عبدالملک بن مروان کے تسلط میں آگیا (7)۔

مورخین بیان کرتے ہیں کہ ۹۹ھ میں عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تواُنھوں نے سب سے پہلے بنوہاشم کے ساتھ اسّی سال سے جاری ناروا سلوک اور اُن کی حق تلفی کو ختم کیااور بنوہاشم کا باغ فدک پر دعویٰ تسلیم کرتے ہوئے اُنہیں باغِ فدک واپس کر دیا، جس سے بنوہاشم کے معاشی حالات بہتر ہوگئے(8)۔ عمر بن العزیز کی رحلت کے بعدیزید بن عبدالملک نے ۱۰۱ھ میں اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیااورایک بار پھر بنوہاشم سے باغ فدک چھین لیااور اسے آلِ مروان کو میراث کے طور پر دے دیااور پرانی اُموی روش اپنالی،اس طرح وہ تمام عیوب پھر سے اقتدار میں داخل ہوگئے، جنہیں عمر بن عبدالعزیز نے ختم کیا تھا۔

عمر بن عبد العزیز کی موت کے بعدیزید بن عبدالملک بن مروان بر سر اقتدار آیا تو پورے ملک میں ایک بار پھر کھلے عام فسق وفجور شروع ہوگیا۔ اُموی طرزِ حکومت کے بارے میں ڈاکٹر حمید الدین کہتے ہیں کہ بنواُمیہ کی شخصی حکومت میں بیت المال سے آمدنی کا بیشتر حصہ بادشاہ کے ذاتی استعمال پر صرف ہوتا تھااور جو کچھ باقی بچتاتھااسے شاہی خاندان کے لوگوں کو وظائف کی شکل میں دے دیا جاتا تھا۔ اس طرح پورا بیت المال امویوں کے لیے وقف تھا(9)۔ دوسری طرف اموی بادشاہوں نے بنوہاشم کا معاشی استحصال کیااور خود عیش و عشرت کی زندگی گزاری اور پورے ملک میں فسق وفجور کو فروغ دیا۔ جس پر حضرت زید شہید علیہ السلام نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا، اس بات کی طرف ابن عساکر، ابو الفرج اصفہانی نے اشارہ کرتے ہوئے ایک روایت نقل کی ہے(10):

قال: اردت الخروج الی الحج فمررت بالمدینة فقلت: لو دخلت علی زید بن علی فدخلت فسلمت علیه فسمعته یتمثل:

زکریا بیان کرتا ہے وہ زیارت کی غرض سے مدینہ منورہ سے ہوتا ہوا مکہ معظّمہ جارہا تھا، اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ زید بن علی علیہ السلام کے پاس حاضری دے۔ لہٰذا وہ ان سے ملنے ان کے گھر گیا اور سلام کیا۔ آپ نے اس سے دوران گفتگو یہ اشعار پڑھے:

و من یطلب المال الممنع بالقنا　　یعش ماجدا أو تخترمه المخارم

متی تجمع القلب الذکی و صارما　　وأنفا حمیا تجتنبك المظالم

و کنت اذا قوم غزونی غزوتهم　　فهل أنا فی ذا یا لهمدان ظالم

جو شخص بزور نیزہ زبردستی بہت زیادہ مال حاصل کرلیتا ہے، وہ بڑی عیش وآرام کی زندگی گزارتا ہے یا پھر ذلت و خواری کے ساتھ بیاباں پہاڑوں میں پھرتا ہے۔ اگر تم اُن پر تلوار اُٹھالو اور اپنے عزت نفس کو قبضہ میں کرلو تو یہ چیزیں تمہیں ظلم وستم سے محفوظ رکھیں گی۔ جب مجھ سے کوئی جنگ کرتا ہے تو میں بھی جواب میں اُس سے جنگ کرتا ہوں۔ اے ہمدانی بتاؤ کیا میں اس معاملہ میں ظالم کہلاؤں گا۔

زکریا مزید بیان کرتا ہے کہ حضرت زید شہید علیہ السلام کی باتیں سن کر اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ حضرت زید شہید علیہ السلام اہلبیت رسولؐ کے حقوق کا دفاع کے لئے سر گرم ہیں اور وہ حکومت کے خلاف قیام کریں گے۔ مذکورہ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زید شہید علیہ السلام ہشام بن عبدالملک کی سرپرستی میں مدینہ منورہ میں ہونے والے فسق وفجور سے دل برداشتہ ہوچکے تھے۔ اسی لیے حضرت زید شہید علیہ السلام نے اہل مدینہ سے کہا: جس طرح میرے دادا حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید کے فسق و فجور کے خلاف قیام کیا تھا، بالکل اسی طرح ہشام بن عبدالملک کے خلاف بھی قیام ناگزیر ہے اور تم لوگ اس کام میں میرا ساتھ دو لیکن حکومت کے ظلم وستم کی چکی میں پسے ہوئی ان مستضعفین کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی دیکھ کر حضرت زید شہید علیہ السلام اہل عراق کی جانب سے موصول ہونے والے خطوط کی طرف متوجہ ہوئے اور ان خطوط کو سامنے رکھ کر اپنے بھائی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مشاورت کی اور ان کی تائید حاصل ہونے پر عراق کی طرف روانہ ہوگئے۔

حضرت زید شہید علیہ السلام عراق پہنچے تو اہل عراق کے دلوں میں اُمید کی کرن پیدا ہوئی اور اُنہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ بنو ہاشم کی یہ معروف شخصیت ہی اُن کے لیے مسیحا بن سکتے ہیں۔ اس لیے وہ سب آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ حضرت زید شہید علیہ السلام نے عراق میں اموی گورنر خالد قسری کے ہاتھوں پھیلی ہوئی لادینیت کا مشاہدہ کیا اور دیکھا کہ خالد قسری کے عمال مسلمانوں سے جبری طور پر زکوۃ کی رقم وصول کرکے عیسائیت کے پرچار اور گرجا گھروں کی تعمیر پر خرچ کر رہے تھے اور اگر اہل عراق اس بات پر کوئی احتجاج کرتے تو اُس کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ خالد قسری اپنی عیسائی ماں کے مذہب کی طرف راغب تھا، اسی لیے خالد قسری ابن نصرانیہ کے نام سے معروف ہو گیا تھا (11)۔ خالد قسری کی عراق میں گورنری کے دوران عراق کے حالات کو ابن اثیر نے اس طرح بیان کیا:

ولما ولی یوسف العراق کان الاسلام ذلیلا والحکم فیه الی أهل الذمة (12)

یوسف بن عمر جس وقت عراق کا گورنر بن کر آیا، اہل اسلام ذلیل حالت میں تھے اور ان پر اہل ذمہ کا غلبہ اور اُن کی حکومت تھی۔

ابن خلدون نے بھی اسی طرح عراق کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

ولما ولی یوسف نزلت الذلة بالعراق فی العرب وصار الحکم فیه الی أهل الذمة (13)

یوسف بن عمر ثقفی جس وقت عراق کا گورنر بن کر آیا، اُس وقت عراق میں عرب ذلیل ہو چکے تھے۔

ابن اثیر نے خالد قسری کے مقرر کردہ عمائدین کے اختیارات کے متعلق یحییٰ بن نوفل کا ایک شعر نقل کیا، جس سے عراق کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے:

أتانا وأهل الشرك أهل زکاتنا　　وحکامنا فیانسر ونجهر

مشرکین ہماری زکوۃ کے مالک تھے اور ہمارے ظاہر اور مخفی معاملات کے حاکم تھے (14)۔

ابن اثیر نے فرزدق کے درج ذیل اشعار نقل کیے:

ألا قطع الرحمن ظهر مطیة　　أتتنا تهادی من دمشق بخالد

فکیف یؤم الناس من کانت أمه　　تدین بأن الله لیس بواحد

بنی بیعة فیها النصاری لأمه　　ویهدم من کفر منار المساجد

خدا نے اس سواری کی پیٹھ کیوں نہ توڑ ڈالی، جو ہمارے پاس خالد کو دمشق سے لائی۔ وہ شخص لوگوں کی کس طرح امامت کرسکتا ہے جس کی ماں کا دین یہ ہو کہ اللہ ایک نہیں ہے۔ نصاریٰ نے اس کی ماں کی خوشنودی کے لیے کلیسا بنایا تھا اور وہ کفر کی وجہ سے مسجدوں کے میناروں کو منہدم کرتے تھے(15)۔

ابن اثیر نے بیان کیا جب خالد قسری کے سامنے ایک شاعر نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے:

لیتنی فی المؤذنین حیاتی　　انهم یبصرون من فی السطوح

فیشیرون أو تشیر الیهم　　بالهوی کل ذات دل ملیح

کاش میری زندگی بھی ان موذّنوں کی طرح ہوتی کیونکہ وہ لوگ بالا نشینوں کو دیکھتے ہیں یا تو وہ خود اشارے اور کنایہ کرتے ہیں یا ان کی طرف نازک اندام عورتیں اشارے کرتی ہیں(16)۔

ابن اثیر نے یہ بھی بیان کیا کہ خالد قسری نے مذکورہ اشعار سنے تو اُس نے مساجد کے مؤذنوں کو ہٹانے کی بجائے مساجد کے مینار منہدم کرادیئے اور اپنی ماں کو خوش کرنے کی غرض سے ایک گرجا تعمیر کرایا۔ عراقی عوام نے خالد قسری کے اس فعل کی مذمت کی تو اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے اس معاملے کو در گزر کرنے کے لیے کہا: اگر نصاریٰ کا مذہب تمہارے مذہب سے بدتر ہے تو خدا کی ان پر لعنت ہو۔ خالد قسری مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کے لیے کھلے عام یہ بات کہتا تھا:

ان الخلیفة هشاما أفضل من رسول الله صلی الله علیه وسلم

بے شک خلیفہ ہشام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہے(17)۔

تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک خالد قسری کی اسلام دشمن صفات سے واقف تھا، اسی لیے اُس نے ۱۰۵ھ میں حکومت سنبھالتے ہی خالد قسری کو عراق کا گورنر بنایا تاکہ خالد قسری عراق کے مسلمانوں کی دل آزاری کرے۔ خالد قسری نے اپنے ننھیالی رشتے دار عیسائیوں کو عمال مقرر کرکے عراق کے مسلمانوں کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ ان عمال نے دیندار لوگوں کا جینا محال کردیا اور اسلامی اقدار کو پامال کرکے نئی بدعات کا اجراء کیا۔ مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور اُن سے جبری زکوٰۃ کی رقوم وصول کرکے عیسائیت کے پرچار اور گرجا گھروں کی تعمیر پر خرچ کیں۔

خالد قسری چالباز اور مکار شخص تھا، وہ عراق میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی غرض سے ہشام بن عبدالملک کو پیغمبر ﷺ اسلام سے افضل قرار دیتا اور نماز جمعہ کے خطبات میں اہلبیت رسول ﷺ پر سب و شتم کراتا تھا۔ اس کے دور میں مساجد کے سرکاری موذّن مساجد کے میناروں پر چڑھ کر قرب وجوار میں رہنے والی عورتوں کو اشارے بازی کرتے تھے۔ خالد قسری سے وہاں کے لوگوں نے شکایت کی تواُس نے اُن موذّنوں کو ہٹانے کی بجائے اُن مساجد کے مینار منہدم کرادیئے۔ خالد قسری کے دور حکمرانی کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس کے پندرہ سالہ دور حکمرانی میں عراق کے مسلمانوں پر عیسائی راج مسلط تھا۔ جس نے لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے بے حیائی اور بے دینی کو فروغ دیا، جس کا ذکر فرزدق کے اشعار میں ملتا ہے، جو اوپر بیان کیے جاچکے ہیں۔

حضرت زید شہید علیہ السلام مدینہ منورہ کے حالات سے پہلے ہی دل برداشتہ تھے۔ جب اُنھوں نے عراق میں بھی پھیلی ہوئی لادینیت اور نئی بدعات کا مشاہدہ کیا تو اُن کی آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں، آپ ان حالات میں بری طرح گھٹن محسوس کرنے لگے، جس کی طرف سیاغی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا :

کان زید بن علی یری الحیاۃ غراماً وَ کانا ضجرًا بالحیاۃ (18) زید بن علیؑ کے لیے زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی اور وہ زندگی سے تنگ آچکے تھے۔

حضرت زید شہید علیہ السلام نے ظلم و ستم کے اس راج کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنیکا بیڑہ اُٹھایا اور اس کام کو پورا کرنے کے لیے اپنے دادا حضرت امام حسین علیہ السلام کے قول (فلکم فی أسوۃ) پر عمل کیا جس میں اُنھوں نے اپنے قیام کو لوگوں کے لیے (نمونہ) قرار دیا تھا (19)۔ حضرت زید شہیدؑ نے ائمہ اہلبیت علیہ السلام کے اقوال کو اپنی رہنمائی کے لیے سامنے رکھا، جیسے :

- شیخ کلینیؒ نے اسناد کے ساتھ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ حدیث نقل کی ہے:

محمد بن یعقوب الکلینی، عن محمد بن یحیی، عن أحمد بن محمد، عن علی ابن النعمان، عن عبد اللہ بن مسکان، عن داود بن فرقد، عن أبی سعید الزهری، عن أبی جعفر وأبی عبد اللہ علیهما السلام قال: ویل لقوم لایدینون اللہ بالامر بالمعروف والنهی عن المنکر۔ (20)

افسوس ہے اس قوم کے لیے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر کے خدا کا دین اختیار نہیں کرتی۔

- حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اہل کوفہ کو جہاد کی رغبت دلاتے ہوئے اپنے خطبہ میں کہا:

فقبحا لکم وترحا حین صرتم غرضا یرمی۔ یغار علیکم ولا تغیرون، وتغزون ولا تغزون، ویعصی اللہ وترضون (21)۔

تمہارا بُرا ہو تم غم و حزن میں مبتلا رہو، تم تو تیروں کا از خود نشانہ بنے ہوئے ہو۔ تمہیں ہلاک اور تاراج کیا جارہا ہے مگر جوابی حملہ کرنے کے لیے تمہارے قدم نہیں اٹھتے، وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو، اللہ کی نافرمانیاں ہو رہی ہیں اور تم راضی ہو رہے ہو۔

- وما أعمال البر کلها والجهاد فی سبیل اللہ عند الامر بالمعروف والنهی عن المنکر الا کنقیة فی بحر لجی (22)

تمام اعمالِ خیر اور جہاد فی سبیل اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے گہرے سمندر میں لعاب دہن کے قطرے ہوں۔

حضرت زید شہید علیہ السلام نے قرآنی معارف کی روشنی میں ہشام بن عبدالملک کی حکومت کے خلاف قیام کے لیے راہ ہموار کی۔ آپ کے علم میں پیغمبر اسلام ﷺ کی وہ احادیث تھیں، جن میں آپ کے قتل اور نعش کو سولی دیئے جانے کے علاوہ دیگر واقعات کی خبر دی گئی تھی۔ اس لیے حضرت زید شہید علیہ السلام کو یقین کامل تھا کہ اُن کے ساتھ بہر صورت وہ سب حالات پیش آئیں گے، جن کی پیغمبر اسلام ﷺ نے خبر دی تھی۔ حضرت زید شہید علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کی حیات میں اُن کے قیام کے فوری نتائج نہیں نکلیں گے، بلکہ آپ کی شہادت کے بعد اس کے ثمرات برآمد ہونگے۔

حضرت زید شہید علیہ السلام جانتے تھے کہ بیاسی سال سے قائم حکومت کو گرانا آسان نہیں بلکہ یہ کام کانٹوں کی سیج کی طرح کٹھن راہ ہے، جس پر ہر شخص کے لیے چلنا ممکن نہیں ہوگا مگر جو لوگ اس راہ پر چلنے کی قوت اور ارادہ رکھتے ہیں، انہیں اس پر چلا کر امر بالمعروف وَ نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا جائے تو ہشام بن عبدالملک کے اقتدار کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کمزور کیا جاسکتا ہے تاکہ مستقبل میں اس کے

خلاف اُٹھنے والی تحریکوں کی کامیابی کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ حضرت زید شہید علیہ السلام نے مدینہ منورہ چھوڑنے سے قبل اپنے قیام کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا، جس کا ذکر ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں کیا ہے:

حدثنی عبد الرحمن بن عبد الله الزهری قال دخل زید بن علی مسجد رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم نصف النهار فی یوم حار من باب السوق فرآنی سعد بن ابراهیم فی جماعة من القرشیین قد حان قیامهم فأشار الیهم فقال لهم سعد بن ابراهیم هذا زید یشیر الیکم فقوموا له فجائهم فقال أی قوم أنتم أضعف من أهل الحرة فقالوا لا فقال فأنا أشهد أن یزیدا لیس شرا من هشام بن عبد الملك فما لکم فقال سعد لأصحابه مدة هذا قصیرة فلم ینشب أن خرج فقتل۔ (23)

حضرت زید بن علیؑ ایک دن مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، جن میں سعد بن ابراہیم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ان لوگوں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: کیا آپ لوگ واقعہ حرہ میں شہید ہونے والے افراد سے بھی زیادہ شکستہ وَ ناتواں ہیں؟ تو لوگوں نے نفی میں جواب دیا۔ پس حضرت زید بن علیؑ نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ یزید ہشام سے زیادہ فاسق وفاجر نہیں تھا"۔ پھر آپ لوگ کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں؟ اس کے خلاف بھی اسی طرح قیام ناگزیر ہے، جس طرح یزید کے خلاف حضرت امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تھا۔

مورخین کا کہنا ہے جب حضرت زید شہید علیہ السلام عراق پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ عراق کے عوام ہی کیا، وہاں کے تمام فقہاء نے جن میں امام ابو حنیفہ بھی شامل تھے، ہشام بن عبد الملک کی حکومت سے بیزاری کا اظہار کیا اور وہ لوگ اس کی حکومت کو اسلامی حکومت کے زمرے میں نہیں لاتے تھے (24)۔

حضرت زید شہید علیہ السلام کو عراقی عوام نے ان کی قائدانہ صلاحیتیں دیکھ کر اپنا قائد منتخب کیا اور آپ کی معیت میں جنگ لڑنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے آپ کی بیعت کی، جن کی تعداد اسّی ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ حضرت زید شہید علیہ السلام کے ملک سے فسق وفجور کے خاتمے، قرآن وسنت کے احیاء کے لیے کیے جانے والے قیام کے اسباب سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ابو منصور عبدالقادر بن طاہر بن محمد بغدادی شافعی اشعری نے یہ بات نقل کی:

انما خرجت علی بنی امیة الذین قاتلوا جدی الحسین وأغاروا علی المدینة یوم الحرة ثم رموا بیت اللہ بحجر المنجنیق والنار ففارقوہ عند ذلك۔(25)

میں نے بنو اُمیہ کے خلاف اس لیے خروج کیا ہے کہ انہوں نے میرے دادا حسینؑ کو قتل کیا اور حرہ کی جنگ میں مدینہ میں لوٹ مار کی اور خانہ کعبہ پر منجنیق سے سنگ باری کی اور اسے آگ لگادی۔

تحقیق کی بنیاد پر اس روایت کو قبول نہیں کیا جاسکتا, کیونکہ تفسیر فرات میں حضرت زید شہید علیہ السلام کا قیام کے موقع پر دیا گیا ایک خطبہ نقل کیا گیا ہے، جس میں حضرت زید شہید علیہ السلام نے اپنے قیام کے اسباب بیان کیے ہیں اور ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کی بنیاد پر لوگوں کو جہاد کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ حضرت زید شہید علیہ السلام کے خطبے سے ایک اقتباس نمونہ کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

ألستم تعلمون أنا ولد نبیکم المظلومون المقهورون فلا سهم وفینا، ولا تراث اعطینا، وما زالت بیوتنا تهدم، وحرمنا تنتهك، وقائلنا یعرف، یولد مولودنا فی الخوف، وینشؤ ناشئنا بالقهر، ویموت میتنا بالذل۔ ویحکم ان اللہ قد فرض علیکم جهاد أهل البغی والعدوان من امتکم علی بغیهم، وفرض نصرة أولیائه الداعین الی اللہ والی کتابه، قال: " فلینصرن اللہ من ینصره ان اللہ لقوی عزیز" (سورہ الحج آیت: ۴۰) ویحکم انا قوم غضبنا للہ ربنا، ونقمنا الجور المعمول به فی أهل ملتنا، ووضعنا من توارث الامامة والخلافة ویحکم بالهواء ونقض العهد وصلی الصلاة لغیر وقتها، وأخذ الزکاة من غیر وجهها، ودفعها الی غیر أهلها، ونسك المناسك بغیر هدیها، وأزال الاقیاء والاخماس والغنائم، ومنعها الفقراء والمساکین وابن السبیل، وعطل الحدود وأخذ بها الجزیل، وحکم بالرشا والشفاعات والمنازل وقرب الفاسقین، ومثل بالصالحین، واستعمل الخیانة، وخون أهل الامانة، وسلط المجوس، وجهز الجیوش، وخلد فی المحابس، وجلد المبین، وقتل الوالد، وأمر بالمنکر، ونهی عن المعروف، بغیر مأخوذ عن کتاب اللہ، ولا سنة نبیه، ثم یزعم زاعمکم أن اللہ استخلفه، یحکم بخلافه، ویصد عن سبیله، وینتهك محارمه، ویقتل من دعا الی أمره، فمن أشر عند اللہ منزلة ممن افتری علی اللہ

كذبا، أو صد عن سبيله، أو بغاه عوجا، ومن أعظم عند الله أجرا ممن أطاعه، وآذن بأمره، وجاهد في سبيله، وسارع في الجهاد، ومن أحقر عند الله منزلة ممن يزعم أن بغير ذلك يمن عليه، ثم يترك ذلك استخفافا بحقه وتهاونا في أمر الله، وايثارا للدنيا " ومن أحسن قولا ممن دعا الى الله وعمل صالحا وقال انني من المسلمين " (سورہ فصلت، آیت۔ ۳۳) (26)۔

کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ ہم تمہارے نبی ﷺ کی اولاد ہیں، ہم مظلوم و لاچار ہیں، ہم اپنے حقوق سے محروم کیے گئے اور ہمیں ہماری میراث نہیں ملی۔ ہمارے گھروں کو تاراج کیا گیا اور ہماری ناموس کو رسوا کیا گیا۔ ہمارے بچے خوف کی حالت میں پیدا ہوئے اور ہمارا ہر نشو نماء پانے والا بچہ ظلم و جور کی فضا میں پرورش پاتا ہے اور ہمارا مرنے والا ذلت اور محرومی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔افسوس ہے تم لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ خدا کی طرف سے تم پر تمہاری اُمت کے سرکشوں اور ظالموں سے جہاد فرض کیا گیا ہے اور ان اولیاء کی مدد کرنا بھی تمہارا فرض ہے، جو خدا اور اُس کی کتاب کی طرف بلاتے ہیں۔ اُسی کا ارشاد ہے " یقیناً خدا اس شخص کا مددگار ہے جو اس کے دین کی مدد کرے بیشک خدا تو طاقت والا اور غلبہ والا ہے " (سورہ الحج آیت: ۴۰)۔ہم وہ قوم ہیں کہ جب کسی پر غضبناک ہوتے ہیں تو صرف خدا کے لیے ہوتے ہیں اور ہم کسی پر ظلم کرنا عیب سمجھتے ہیں، جو ہماری ملت میں جاری ہے۔ امامت و خلافت کے ورثہ میں آجانے سے ہم ذلیل قرار دے دیئے گئے۔افسوس تم نے خواہشوں کی پیروی کی اور عہد کو توڑ دیا، بے وقت نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ وصول کی تو جائز طریقے کے بغیر اور وہ بھی جس کے حوالے کی تو وہ اُس کا اہل نہ تھا، حج کی عبادت بجالائے تو قربانی کے بغیر اور عطایا و خمس اور اموالِ غنیمت کو برباد کر دیا، مسکینوں اور مسافروں کو اُن کا حق نہیں دیا جن کے وہ مستحق تھے۔ شرعی حدود وَ قوانین کو معطل اور بیکار سمجھ لیا اور ان کے بدلے میں خوب دولت سمیٹ لی، رشتوں، سفارشوں اور عہدے حاصل کرنے کا بازار گرم کر دیا اور اوباش فاسقوں کی قربت حاصل کی، نیک لوگوں کو سزا دی گئی۔ خیانت کا کاروبار چمکنے لگا اور دیانت دار اور امانت دار لوگ خائن قرار دیئے گئے، لوگوں پر مجوسی مسلط کر دیئے گئے، دولت کو فوج اور لشکروں کی تیاری میں صرف کیا

گیا اور بے گناہوں کو مقید کیا گیا، اہل فضیلت کے کوڑے لگائے گئے۔ باپ مار ڈالے گئے اور بچے یتیم ہوئے، برائی کا حکم دیا گیا، نیکی سے روکا گیا اور یہ سب کچھ کتاب خدا اور سنت رسول ﷺ کو سمجھے بغیر کیا گیا۔ پھر بھی تم میں سے گمان کرنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے خلافت عطاء کی، وہ اس کی مخالفت میں حکم دیتا ہے اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتا ہے اور اس کی محترم چیزوں کی بے حرمتی کرتا ہے اور جو شخص بھی امر خدا کی طرف بلاتا ہے، اُسے قتل کر ڈالتا ہے۔ وہ شخص خدا کے نزدیک کتنا بدتر ہے، جو خدا پر جھوٹ کا طوفان باندھے یا دوسروں کو اس کی راہ سے روکے یا اُس سے بغاوت پر آمادہ ہو جائے اور وہ لوگ خدا کے یہاں عظیم اجر کے مستحق ہیں۔ جو اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور اس کے امر کا اعلان کرتے اور اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں بلکہ اس میں جلدی کرتے ہیں۔ وہ شخص خدا کے نزدیک کم حیثیت والا ہے، جو یہ خیال کرتا ہے کہ ان امور کے بغیر اس کے ساتھ بھلائی کی جائے گی اور وہ ان سب امور کو خدا کے حق کو کم تر اور اس کے حکم کو ہیچ سمجھتے ہوئے چھوڑ بیٹھے اور دنیا کے لیے ایثار کرے۔ وہ شخص کتنا اچھا ہے، جو اس کا قائل ہو جائے "اس سے عمدہ بات کس کی ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) اللہ اور اعمال صالح کی جانب بلائے اور کہے کہ بے شک میں فرمانبرداروں میں سے ہوں"۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زید شہید علیہ السلام نے اپنے خاندان اور دیگر مستضعفین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ حکمرانوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا تھا۔ اس لیے صرف واقعہ کربلا یا جنگ حرہ کی بات حضرت زید شہید علیہ السلام کے قیام کا سبب نہ تھیں بلکہ اس کے پیچھے بہت سے اور عوامل تھے، جن کی مورخین نے پردہ پوشی کی, لیکن حضرت زید شہید علیہ السلام نے اپنے خطبہ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ بغدادی نے لوگوں کی توجہ ان باتوں کی طرف سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی ہے، جن کی بنا پر حضرت زید شہید علیہ السلام نے قیام کیا تھا۔

حضرت زید شہید علیہ السلام پورے ملک سے فسق و فجور اور ظلم و جور کا خاتمہ چاہتے تھے اور اپنے خاندان سمیت تمام مظلومین اور مستضعفین کو اس ہیجانی کیفیت سے نجات دلانا چاہتے تھے، جبکہ مورخین نے ہشام کے فسق و فجور اور اُس کے ظلم و جور پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی۔ جس کی بناء پر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ حضرت زید شہید علیہ السلام نے دعویٰ امامت کیا اور یہ بات اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اموی

حکمرانوں نے بنوہاشم کو اپنی حکومت کے خلاف قیام سے روکنے کے لیے جہاد کے خلاف احادیث وضع کرائیں، جو ہشام کے دور میں اتنی شدت کے ساتھ مشتہر ہوئیں کہ آج تک لوگوں کے اذہان میں حضرت زید شہید علیہ السلام کے قیام سے متعلق شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شیخ کلینیؒ کی کتاب اصول کافی میں بھی ایک ایسی روایت پائی جاتی ہے جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ حضرت زید امام باقر علیہ السلام کی امامت کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ اس روایت میں آیا ہے:۔

محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن الحسين بن الجارود، عن موسى بن بكر بن دأب، عمن حدثه، عن أبي جعفر عليه السلام أن زيد بن على بن الحسين عليه السلام دخل على أبي جعفر محمد بن على ومعه كتب من أهل الكوفة يدعونه فيها الى أنفسهم ويخبرونه باجتماعهم ويأمرونه بالخروج، فقال له أبو جعفر عليه السلام: ـــ فلا تعجل، فان الله لا يجعل لعجلة العباد ولا تسبقن الله فتعجزك البلية فتصرعك، قال: فغضب زيد عند ذلك، ثم قال: ليس الامام منا من جلس فى بيته و أرخى سترة وثبط عن الجهاد ولكن الامام منا من منع حوزته، وجاهد فى سبيل الله حق جهاده ودفع عن رعيته وذب عن حريمه، قال ابوجعفر عليه السلام ـــ أتريد يا أخى أن تحيى ملة قوم قد كفروا بآيات الله وعصوا رسوله واتبعوا أهواء هم بغير هدى من الله وادعوا الخلافة بلا برهان من الله ولا عهد من رسوله؟ أعيذك بالله يا أخى أن تكون غدا المصلوب بالكناسة ثم ارفضت عيناه وسالت دموعه، ثم قال: الله بيننا وبين من هتك سترنا وجحدنا حقنا وأفشى سرنا ونسبنا الى غير جدنا وقال فينا ما لم نقله فى أنفسنا۔(27)

ترجمہ: "محمد بن یحییٰ نے احمد بن محمد بن حسین بن سعید سے حسین بن جارود سے موسیٰ بن بکیر بن داب نے اس شخص سے جس نے ابو جعفرؑ حضرت امام محمد باقرؑ سے کہ حضرت زید بن علی بن حسینؑ، حضرت ابو جعفرؑ محمد بن علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے پاس اہل کوفہ کے خطوط تھے کہ جن میں وہ انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے اجتماع کی

خبر دیتے اور انہیں خروج کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ تب حضرت ابو جعفرؑ حضرت امام محمد باقرؑ نے ان سے پوچھا: ان خطوط کی ابتداء ان کی طرف سے ہوئی ہے یا یہ ان کا جواب ہیں، جو آپ نے ان کی طرف لکھے ہیں اور جس چیز کی طرف آپ نے انہیں بلایا ہے؟ زیدؑ نے کہا: ان لوگوں کی طرف سے ابتداء ہے، ان کی معرفت کی جو ہمارے حق کی وجہ سے ہے، ہماری رسول اللہ ﷺ سے قرابت کی بناء پر اور بہ سبب اس کے کہ اللہ عزو جل کی کتاب میں ہماری مودت کے وجوب اور ہماری اطاعت کے فرض ہونے کا ذکر ہے اور بہ سبب اس چیز کے جس کی تنگی اور مصیبت میں وہ ہمیں مبتلا پاتے ہیں۔ پس آپ سے حضرت ابو جعفرؑ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اطاعت تو اللہ عزو جل کی طرف سے فرض کی گئی ہے، جو ایسی سنت ہے کہ اولین سے جاری رہی ہے اب اس کا اعادہ ہوا ہے کہ آخرین میں اطاعت ہم میں سے ایک کے لیے ہے اور مودت اور محبت سب کے لیے ہے اور اللہ کا حکم اپنے اولیاء کے لیے جاری ہوتا ہے۔ حکم موصول۔ قضائے محصول (فیصلہ شدہ) کے حتم مقتضی (ایسا حتمی امر جو قضاء و قدر میں آچکا ہے) اور قدر و مقدور اور اجل مسمّٰی و معین کے ساتھ وقت معلوم کے لیے ہے۔ پس وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے، وہ تمہیں خفیف اور ہلکا پھلکا نہ بنادیں۔ وہ کبھی بھی تمہیں کسی چیز میں اللہ سے بے پرواہ نہیں کر سکتے۔ پس دیکھو کہ بلاء مصیبت تمہیں عاجز کر دے گی اور تمہیں پچھاڑ دے گی۔ راوی کہتا ہے۔ اس پر زیدؑ غصہ میں آگئے اور کہا: ہم میں سے وہ امام نہیں ہے، جو اپنے گھر میں بیٹھ جائے اور اپنے سامنے پردہ ڈال دے اور جہاد سے روکے بلکہ ہم میں سے امام وہ ہے، جو اپنے مرکز کی حفاظت کرے اور اللہ کی راہ میں اس طرح جہاد کرے، جو جہاد کا حق ہے اور اپنی رعیت کا دفاع کرے اور اپنے حریم سے دشمن کو روکے۔

ابو جعفرؑ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا! اے بھائی! کیا تم اپنے نفس میں ان میں سے کوئی چیز رکھتے ہو جس کی تم نے امام کی طرف نسبت دی ہے۔ پس اس پر اللہ کی کتاب سے کوئی شاہد یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کوئی حجت لا سکتے ہو یا اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہو؟ اللہ عزو جل نے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام قرار دیا ہے، کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، کچھ مثالیں بیان کی ہیں اور کچھ سنن معین کیے ہیں۔ جو امام اس کے امر کے ساتھ قائم ہے، اسے اس چیز

میں شبہ نہیں ہوتا کہ جو اطاعت اس پر فرض کی گئی ہے یا یہ کہ وہ کسی امر میں اس کے عمل سے سبقت کرے یا اس کا وقت آنے سے پہلے اس میں کوشش کرے۔

۔۔۔اے بھائی! کیا تم چاہتے ہو کہ اس قوم کے مذہب کو زندگی دو جس نے اللہ کی آیات کا کفر کیا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ اللہ تعالی کی طرف سے برہان کے بغیر اور اس کے رسول کے عہد کے بغیر خلافت کا دعویٰ کیا۔ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں۔اے بھائی تم کل کناسہ میں سولی پر لٹکائے جاؤ۔ پھر آپ کی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا: اللہ ہمارے اور اس کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے۔ جس نے پردوں کو چاک کیا اور ہمارے حق کا انکار کیا اور ہمارے راز کو فاش کیا اور ہمیں ہمارے جد کے علاوہ منسوب کیا اور ہمارے بارے میں وہ کچھ کہا، جو ہم نے اپنے متعلق نہیں کہا ہے۔"

مذکورہ روایت کے حوالے سے یہ کہنا ضروری ہے کہ سب سے پہلے تو اس روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت زید، اپنے زمانہ کے امام کی امامت کے قائل نہ تھے۔ اور اگر اس روایت سے یہ ثابت ہوتا بھی ہو تو خود یہ روایت بعض اہل تحقیق کی نظر میں ایک مرسل روایت ہے۔ جس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ آیت للہ منتظری اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

انها مرسلة ، مضافا الى ان الحسين بن الجارود وموسى بن بكر بن دأب كليهما مجهولان لم يذكرا فى كتب الرجال بمدح ولا قدح۔۔۔(28)

آیت اللہ منتظری نے اس روایت کو مرسلہ قرار دیا ہے؛ یعنی ایسی روایت جس کے درمیان میں راوی چھوٹا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں، ان کے نزدیک حسین بن جارود اور موسی بن بکر بن داب دونوں مجہول ہیں۔ کتب رجال میں ان کا تذکرہ نہ مدح کے ساتھ ہے اور نہ قدح کے ساتھ ہے۔

نیز اس روایت میں زید پر تعریض و طنز نہیں بلکہ اس پر ہے کہ جس نے ان کے ساتھ اور زید کے ساتھ دشمنی کی۔ زیدؑ کے فضائل میں ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے، کیونکہ وہ آلِ محمد علیہم السلام کی رضا کے لیے حکومت طلب کرتے تھے اور اپنے لیے طلب نہیں کرتے تھے۔ آیت اللہ منتظری کے مطابق زیدؑ اپنے زمانہ کے امام اور حجت کو پہچانتے تھے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ

وہ ان کے بارے میں برا گمان کرے۔ جیسا کہ انہوں نے علامہ مجلسیؒ کی مراۃ العقول سے اس روایت کے ذیل میں ان سے یہ بیان نقل کیا ہے کہ زید کے بارے میں روایات و اخبار مختلف ہیں۔ بعض ان کی مذمت پر دلالت کرتی ہیں اور اکثر ان کے قابل قدر ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ انہوں نے خود امامت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ وہ حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ کی امامت کے قائل تھے اور انہوں نے خون حضرت امام حسینؑ کے مطالبہ کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے خروج کیا اور وہ آل محمد ﷺ کی رضا کی طرف دعوت دیتے تھے۔

ہمارے اکثر علماء اسی بات کی طرف گئے ہیں اور میں نے ان کے کلام میں اس کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں دیکھا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مخفی طور پر امام ی کے اذن یافتہ تھے۔ اس کے بعد آیت اللہ منتظری لکھتے ہیں کہ:

ونحن نقول اجمالا ان قولنا بقداسة زيد وحسن نيته في قيامه ليس قولا بعصمته وعدم صدور اشتباه منه طيلة عمره وعدم احتياجه الى هداية الامام ونصيحته له أصلا۔ ولعله في بادي الأمر اشتبه عليه الأمر وصار أسيرا للأحاسيس الآنية فنبهه الامام الباقر (عليه السلام) وحذره من الاستعجال والاغترار والاعتماد على بعض من لا يعتمد عليه ۔ ووفاة الامام الباقر (عليه السلام) على ما في أصول الكافي۔(29) كانت في سنة ۱۱۴ من الهجرة، وقيام زيد المؤيد عند الأئمة (عليهم السلام) على ما ذكره أرباب السير كان في عصر الامام الصادق (عليه السلام) في سنة ۱۲۱ه، فلعل الظروف والأجواء اختلقت في صفحة عسى ان تكرهوا شيئا وهو خير لكم وتتريب عليه بركات من جهات اخر۔ هذه المدة، وهو على ما في بعض الأخبار كان مقرا بامامة الامام الصادق (ع) وانه حجة زمانه۔

ہم اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ ہمارا زیدؑ کی عظمت و بزرگی اور ان کے قیام میں حسن نیت کا قائل ہونا، ان کی عصمت کا قائل ہونا نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ساری عمر اُن سے کوئی اشتباہ صادر نہیں ہوا اور وہ امام کی ہدایت اور ان کی نصیحت کے بالکل محتاج نہ تھے۔ ممکن ہے ابتداء میں ان پر معاملہ مشتبہ ہو اور وہ وقتی احساسات و جذبات کے اسیر ہوں۔ پس حضرت امام محمد باقرؑ نے انہیں تنبیہ کی اور جلد بازی، دھوکہ میں آنے اور بعض ایسے لوگوں سے جو قابل اعتماد نہ تھے ڈرایا ہو۔ پھر حضرت امام محمد باقرؑ کی وفات جیسا کہ اصول کافی میں ہے کہ ۱۱۴ھجری میں ہوئی ہے اور زید کا قیام جو ائمہ کے موید تھے، حضرت امام جعفر

صادقؑ کے زمانے ۱۲۱ھجری میں ہوا ہے، جیسا کہ ارباب سِیر نے ذکر کیا ہے۔ شاید وقت اور فضا اُس مدت میں مختلف ہواور زیدؑ بعض اخبار و روایتوں کے مطابق حضرت امام جعفر صادقؑ کی امامت کے قائل ہوئے اور آنجناب ان کے زمانہ کی حجت تھے۔

آیت اللہ منتظری کے تبصرے (30) کی روشنی میں یہ بات کہنا مناسب ہوگی کہ اصول کافی کی روایت اشکال سے خالی نہیں ہے کیونکہ مسعودی نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ حضرت زید شہیدؑ کی حضرت امام محمد باقرؑ سے آخری ملاقات اُس وقت ہوئی جب آپ مدینے سے کوفہ کے لیے روانہ ہوئے تھے اور حضرت امام محمد باقرؑ نے انہیں اپنی شہادت کی خبر دیتے ہوئے یہ بتایا کہ اب ان دونوں کی آپس میں دوبارہ زندگی میں ملاقات نہ ہوگی (31)۔

بلکہ بعض روایات سے یہ امر سامنے آتا ہے کہ حضرت زید ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی امامت کے قائل تھے اور ان کی اطاعت کو فرض قرار دیتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے ایک موقع پر سلیمان بن خالد سے کہا کہ احکامِ شریعت یعنی حلال و حرام میں حضرت جعفر صادقؑ ہمارے پیشوااور امام ہیں (32)۔اس کے علاوہ عمرو بن خالد ابو خالد واسطی بیان کرتے ہیں حضرت زید بن امام زین العابدینؑ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں میرے بھتیجے جعفر بن محمدؑ امام وقت ہیں، جو اُن کی پیروی کرے گا وہ گمراہ نہ ہوگا اور جو ان کی مخالفت کرے گا، وہ ہدایت نہیں پاسکتا (33)۔یہی نہیں بلکہ دلیل کے طور حضرت زید شہیدؑ کا یہ قول بھی ملتا ہے: "قول زید بن علی من أراد الجهاد فالی ومن أراد العلم فالی ابن أخی جعفر" (34) یعنی: " جو جہاد کرنا چاہتا ہو، وہ میرے ساتھ آئے اور جو علم کا خواہشمند ہو، وہ میرے بھتیجے حضرت امام جعفر صادقؑ کی طرف چلا جائے۔"

حضرت زید شہید علیہ السلام نے کسی موقع پر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی حکم عدولی نہیں کی اور نہ ہی کبھی اُنہوں نے امامت کا دعوی کیا بلکہ یہ اموی حکمرانوں کی جانب سے کیا ہوا پروپیگنڈا تھا، جسے اُنہوں نے لوگوں کو اُن سے دور کرنے کے لیے کیا حالانکہ حضرت زید شہید علیہ السلام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مخفی طور پر اِذن یافتہ تھے۔

*****

## حوالہ جات


1۔ابن کثیر،علامہ حافظ ابوالفداعماد الدین دمشقی، البدایۃ والنہایۃ، تحقیق وتدقیق وتعلیق : علی شیری، الناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت، طبع الأولی ۱۹۸۸ء، ج ۸، ص ۲۰۹؛اصفہانی، ابو الفرج، مقاتل الطالبیین، تحقیق محمد حسن محمد حسن اسماعیل، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۷ء، ص ۶۷؛الطبری، محمد بن جریر الطبری، المسترشد، تحقیق: الشیخ أحمد المحمودی، الناشر مؤسسۃ الثقافۃ الاسلامیۃ لکوشانبور، قم، ص ۵۱۰؛ابن اعثم، احمد الکوفی، کتاب الفتوح، تحقیق: علی شیری، الناشر: دار الأضواء للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۱ھ، ج ۵، ۱۲۹؛ مجلسی، علامہ، محمد باقر، بحار الانوار، مطبعۃ دار احیاء التراث العربی، مؤسسۃ الوفاء، بیروت، ۱۹۸۳ء، ج ۴۵، ص ۱۵۷۔

2۔طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، مطبوعہ موسسۃ الاعلمی، المطبعۃ الاستقامہ قاہرہ، ج ۴، ص ۳۷۲ تا ۳۷۹؛ابن الاثیر، محمد بن محمد الجزری، الکامل فی التاریخ، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، قاہرہ، ج ۳، ص ۳۱۰ تا ۳۱۳؛ایضاً، ج ۸، ص ۲۱۹ تا ۲۲۱؛مسعودی، ابوالحسن علی بن الحسین بن علی، مروج الزہب و معادن الجواہر، مطبوعہ دار الھجرۃ، قم، ج ۳، ص ۶۹؛ابن الطقطقی، محمد بن علی بن طباطبا، الفخری فی الآداب السلطانیۃ والدولۃ الاسلامیۃ، تحقیق: عبد القادر محمد مایو، مطبعۃ دار القلم العربی، ط۔الأولی، ۱۴۱۸ھ بیروت، ص ۱۱۸؛

*Hitti, Philip.K. A Short History of Syria Published by Macmillan & Co. Ltd.New York 1959 AD.*

3۔السیوطی، عبد الرحمٰن بن أبی بکر، تاریخ الخلفاء، تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید، الناشر: مطبعۃ السعادۃ، قاہرہ، الطبعۃ الأولی، ۱۹۵۲ء، ص ۱۸۲۔

4۔ایضاً، تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۲؛الکامل فی التاریخ، ج ۴، ص ۱۷۰؛ تاریخ طبری، مطبوعہ موسسۃ الاعلمی، المطبعۃ الاستقامہ قاہرہ، ج ۴، ص ۳۸۳؛البدایہ والنہایہ، مطبعۃ السعادہ، قاھرہ، ج ۸، ص ۲۲۵

5۔مروج الزہب و معادن الجواہر، ج ۲، ص ۸۶؛الفخری فی الآداب السلطانیۃ والدولۃ الاسلامیۃ، ص ۱۲۱

6۔الکامل فی التاریخ، ج ۴، ص ۲۵۰؛نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، مختار ثقفی، مطبوعہ قرطاس، کراچی یونیورسٹی، ص ۴۲ تا ص ۴۸۔

7۔الکامل فی التاریخ، ج ۴، ص ۳۲۵؛

*NICHOLSON, REYNOD A., ALITERARY HISTORY OF THE ARABS, THE UNIVERSIT Y PRESS, CAMBRIDGE, 1953, PAGE NO.198.*

8۔حمید الدین، ڈاکٹر، تاریخ اسلام، مطبوعہ فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۳۲۸

9۔ایضاً، ص ۳۳۴

10۔ابن عساکر، ابوالقاسم علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ الشافعی، تہذیب التاریخ دمشق الکبیر، مرتبۃ الشیخ عبدالقادر بدران، دار احیاء التراث العربی الطباعہ والنشر والتوزیع، بیروت، ج۱۹، ص۴۶۹؛ مقاتل الطالبیین، ص۷۳؛ عقیلی، عمر بن احمد بن ہبۃ اللہ بن ابی جرادۃ، بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب، المحقق: دکتر سہیل زکار، الناشر: دار الفکر، بیروت، ج۴، ص۱۶۳

11۔الکامل فی التاریخ، ج۵، ص۲۳۳، ۲۳۲

12۔ایضاً، ج۴، ص۴۳۹

13۔ابن خلدون، عبدالرحمٰن ابن خلدون المغربی، کتاب العبر ودیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر، مطبعۃ مؤسسۃ الأعلمی، بیروت، ۱۹۷۱ء، ج۳، ص۹۷

14۔الکامل فی التاریخ۔ابن الأثیر، ج۵، ص۲۲۴

15۔ایضاً، ج۵، ص۲۷۹، محولہ۔

16۔ایضاً، ج۵، ص۲۷۹، محولہ۔

17۔ایضاً، ج۵، ص۲۸۰، محولہ۔

18۔الصنعائی، القاضی شرف الدین الحسین بن احمد السیاغی، الروض النضیر شرح مجموع الفقہ الکبیر، مطبعۃ السعادۃ، قاہرہ، ج۱، ص۵۵

19۔تاریخ طبری، ج۴، ص۳۰۴؛ الکامل فی التاریخ، ج۴، ص۴۸؛ عسکری، السید مرتضی، معالم المدرستین، مؤسسۃ النعمان للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۹۹۰ء، ج۳، ص۲۷

20۔کلینی، ابو جعفر محمد بن یعقوب، فروع الکافی، تصحیح وتعلیق: علی اکبر الغفاری دار الکتب الاسلامیہ، طہران، ۱۳۹۱ق، ج۵، ص۵۶؛ مجلسی، علامہ، محمد باقر، بحار الانوار، مطبعۃ دار احیاء التراث العربی، مؤسسۃ الوفاء، بیروت، ۱۹۸۳ء، ج۹۷، ص۸۷؛ بروجدی، السید، جامع أحادیث الشیعۃ، منشورات مدینۃ العلم، آیۃ اللہ العظمی الخوئی، قم، ۱۳۶۶ش، ج۱۴، ص۳۹۱

21۔بحار الانوار، ج۴۴، ص۶۴

22۔عاملی، شیخ حر، وسائل الشیعۃ (آل البیت)، المطبعۃ مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام لاحیاء التراث، قم، ج۱۶، ص۱۳۴

23۔ابن عساکر، ابوالقاسم علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ الشافعی، تاریخ مدینہ و دمشق، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ج۱۹، ص۴۶۹؛ عقیلی، عمر بن احمد بن ہبۃ اللہ بن ابی جرادۃ، بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب، المحقق: د۔ سہیل زکار، الناشر: دار الفکر، بیروت، ج۹، ص۴۰۴۳، ۴۰۴۴؛ ابن خلکان، وفوات الوفیات، صلاح کتبی۔ فوات الوفیات (الجزع الاول) ۱۲۸۳ھ، ج۲ ص۳۶۔؛ بستانی، پطرس، دائرۃ المعارف، مطبوعہ بیروت، ۱۸۷۷ء، ج۲، ص۱۰۸

24۔ابو زہرہ، محمد ابو زہرۃ مصری، الامام ابو حنیفہ، مطبوعہ دار الفکر العربی، قاہرہ، ۱۹۴۵ء، ص۳۶۔
25۔بغدادی، عبد القاہر بن طاہر بن محمد، الفرق بین الفرق و بیان الفرقۃ الناجیۃ، الفصل الاول من فصول ہذا الباب فی بیان مقالات فرق الرفض، الناشر دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۷۷ء، ص۲۵
26۔بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۰۶؛الکوفی، فرات بن ابراہیم الکوفی، تفسیر فرات، مطبوعہ ایران،، ۱۹۹۰ء، ص۱۳۶۔
27۔الکافی الکلینی، ج۱، ص۳۵۸، ۳۵۶
28۔منتظری، شیخ آیت اللہ، دراسات فی ولایۃ الفقیہ و فقہ الدولۃ الاسلامیۃ، قم، ج۱، ص۲۱۵ تا ص۲۱۸
29۔الکافی الکلینی، باب مولد ابی جعفر محمد بن علی (ع)، ج۱، ص۴۶۹
30۔آیت اللہ منتظری، ولایت فقیہ اور حکومت اسلامی کے قواعد، مترجم: سید صفدر حسین نجفی، پبلشر: مصباح الہدیٰ پبلی کیشنز۔گنگا رام بلڈنگ، شاہراہ قائد آعظم، لاہور، ج۱، ص۱۹۱، ۱۹۵
31۔مروج الذھب و معادن الجواہر، ج۳، ص۲۰۶؛بحار الأنوار، ج۴۶، ص۱۹۰
32۔ایضاً، ج۴۶، ص۱۹۷؛امین، سید محسن، اعیان الشیعۃ، تحقیق و تخریج: حسن امین، مطبعۃ دار التعارف للمطبوعات، بیروت، ۱۹۸۳ء، ج۷، ص۱۱۳؛ المغربی، القاضی النعمان، شرح الاخبار، تحقیق: السید محمد الحسینی الجلالی، مطبعۃ مؤسسۃ النشر الاسلامی، مؤسسۃ النشر الاسلامی التابعۃ لجماعۃ المدرسین، قم، ج۳، ص۲۹۰، ۲۸۸۔
33۔بحار الانوار، ج۴۶، ص۱۷۳
34۔ایضاً، ج۴۶، ص۱۹۸

# انسانی تربیت کی ضرورت

(افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں)

سید رمیز الحسن موسوی*
srhm2000@yahoo.com

**کلیدی کلمات:** تربیت، انبیائے کرام، ایام طفولیت، نفس انسان

## خلاصہ

انسان اللہ تعالیٰ کی وہ حیرت انگیز مخلوق ہے جو الٰہی کمالات وصفات سے متصف ہے۔ یہ کمالات بغیر تربیت کے نکھر نہیں سکتے۔ لہٰذا انسان کو تربیت کی ضرورت ہے، یہاں ایسی ضرورت مراد ہے جس کے بغیر کوئی شئے اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ انسانی تربیت کی ضرورت کے بارے میں قرآن اور فرامین معصومین میں بھی تاکید کی گئی ہے۔
امام خمینیؒ نے بھی اپنی بہت سی تحریرں اور بیانات میں انسانی تربیت کے ضروری ہونے کی تاکید کی ہے اور بہت سے مقامات پر انسان میں چھپے ہوئے کمالات کو نکھرانے اور منصہ شہود میں لانے کے لئے تربیت اور تزکیہ نفس کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور ان کے بغیر انسان کی ہلاکت اور نابودی کو یقینی قرار دیا ہے۔ امام خمینیؒ کے نزدیک انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک تربیت کا محتاج ہے اور تمام انبیائے کرام انسانوں کی تربیت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اور انسان کے لئے کمالات تک پہنچنے کے لئے انبیائے کرامؑ کی پیروی کرنا اور اُن کی زیر تربیت رہنا ضروری ہے۔

*۔مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت) بھارہ کہو، اسلام آباد

**مقدمہ**

انسان اللہ تعالیٰ کی حیرت انگیز مخلوق اور اُس کی قدرت کی بلند ترین نشانی ہے۔ انسان تمام الٰہی کمالات و صفات کی استعداد لے کر خلق ہوا ہے تاکہ وہ خلیفۂ الٰہی کے مقام تک پہنچ سکے اور انسان کی یہ استعداد بغیر تربیت کے عملی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ تعلیم وتربیت کی اہمیت کے بعد انسانی تربیت کی ضرورت کا موضوع بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اصل بحث کو شروع کریں، ضرورت کا معنیٰ ذکر کرنا ضروری ہے۔ لغت میں ضرورت ''واجب، لازم، ناچاری اور اضطرار'' کو کہتے ہیں۔ یہاں ہماری مراد ایسی ضرورت ہے کہ جس کے بغیر کوئی زندہ شئے اپنے کمال تک نہیں پہنچ سکتی اور اُسے اپنے تکامل کے لئے اس ضرورت کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا موضوع تعلیم وتربیت ہے تو کیا انسان کو تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کیا وہ تعلیم وتربیت کے بغیر اپنے مطلوبہ کمال تک پہنچ سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تمام ماہرین تعلیم وتربیت نے انسان کی تعلیم اور تربیت پر زور دیا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان بھی کائنات کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرح تبدل وتغیر کا محتاج ہوتا ہے اور اس میں ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونے کی مکمل صلاحیت واستعداد پائی جاتی ہے۔ انسان کائنات کی اُن مخلوقات کی مانند نہیں ہے جو تکویناً کامل اور ایک جیسی حالت میں ہیں اور جن میں اپنی خلقت کے بعد کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اُن پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں کو دیکھتے ہیں کہ جو تکویناً بنے بنائے ہمیں ملے ہیں اور جس حال میں ہیں، اسی حال میں انسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ان کی اسی حالت کو برقرار رکھے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ لائے تاکہ ان سے بہتر استفادہ کرسکے۔

لیکن کائنات کی بعض ایسی چیزیں بھی ہیں کہ جو اپنی خلقت کے بعد مزید کچھ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ان پر مزید کام کرکے اُنہیں بہتر بنایا جاسکتا ہے اور ان سے بہتر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ آیت اللہ مطہری شہید اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''سونا ایک معدنی عنصر ہے جسے

انسان کے استفادے کے لئے مزید بہتر بنانے کی ضرورت پڑتی ہے اگر اُسے اپنی اصلی حالت میں ہی رکھا جائے تو قابل استفادہ نہیں ہے۔ لہٰذا سونے پر سنار کام کرتا ہے اور اسے بناتا ہے اور زیور کی شکل میں لاتا ہے، تب انسان اس کو استعمال میں لاسکتا ہے اور اس کے بعد اس کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔'' (1)

اسی طرح کائنات میں موجود اور بھی بہت سی چیزوں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہماری بحث انسان کے بارے میں ہے کہ آیا انسان اُن مخلوقات میں سے ہے کہ جس پر خلقت کے بعد کسی اور کام کی ضرورت نہیں ہوتی یا انسان کو بھی دنیا میں آنے کے بعد بنانے، سنوارنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی اس دنیوی حیات اور زندگی سے بہتر استفادہ کرسکے اور اپنے مطلوبہ تکامل کو پہنچ سکے۔

یہ بات واضح ہے کہ جس قدر انسان میں تبدیلی اور تحول لایا جاسکتا ہے، کسی اور چیز میں نہیں لایا جاسکتا۔ انسان تحول اور تغیر پذیر مخلوق ہے، اس میں تبدیل اور متغیر ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا انسان کو بہتر سے بہتر زندگی گزارنے یا اپنے کمال تک پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں یہ تبدیلی تعلیم وتربیت ہی کے ذریعے لائی جاسکتی ہے۔ انسان یا تو دوسروں کے زیر نظر بنتا، سنورتا ہے اور تکامل کا راستہ طے کرتا ہے یا خود سازی اور اپنی انسانیت کی تعمیر کے ذریعے کمال کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کو اخلاق بھی کہتے ہیں اور تعلیم وتربیت بھی۔ انسان اخلاق اور تعلیم وتربیت کے مراحل طے کر کے ہی کمال کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان ایک خام مادہ ہوتا ہے جسے قابل استفادہ بنانے کے لئے تعلیم وتربیت کے مرحلے سے گزارنا پڑتا ہے اور اُسے اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنے لئے اور اپنے معاشرے کے لئے قابل استفادہ ہوسکے۔

اگر انسان اور حیوان کے درمیان موازنہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی ان دونوں مخلوقات کے درمیان زمین سے آسمان کا فرق ہے۔ نہ فقط حیوان بلکہ انسان کے علاوہ ہر دوسری چیز بنی بنائی اس دنیا میں آتی ہے جو قابل استفادہ ہوتی ہے۔ انسان متمدن ہے اور تہذیب وتمدن کے زیر سایہ زندگی گزارتا ہے۔ اس کے مقابلے میں حیوان متمدن نہیں ہوتا اور انسان کے تابع ہوتا ہے اور اپنی جبلت میں ہی بنابنایا ہوتا ہے۔ البتہ انسانوں کے ساتھ رہنے کے لئے اسے بھی اہلی بنانا پڑتا ہے، لیکن یہ بھی انسان کی ضرورت ہے تاکہ

وہ حیوان سے استفادہ کرسکے اور اُسے اپنے ساتھ ہم آہنگ رکھ سکے ورنہ حیوان جنگل میں بغیر کسی تعلیم وتربیت کے اپنی جبلت کے تحت زندگی گزارتا ہے۔

## فرامین معصومین علیہم السلام اور انسانی تربیت

اسلامی تعلیمات میں تعلیم وتربیت کی ضرورت کے بارے میں بہت کچھ نقل ہوا ہے، چنانچہ جہاں بھی انبیائے کرامؑ کے مبعوث ہونے کا تذکرہ ہوا ہے وہاں تعلیم وتربیت اور انسانی تزکیہ کو اِن الٰہی نمائندوں کا بنیادی ترین لائحۂ عمل قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ جمعہ کی دوسری آیت میں فرمایا ہے:

”هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ “

ترجمہ: ”وہی ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک (با عظمت) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھیجا وہ اُن پر اُس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن (کے ظاہر و باطن) کو پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، بیشک وہ لوگ اِن (کے تشریف لانے) سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (2)

لہٰذا گمراہی اور ضلالت سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے ساتھ انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور سیرت کی پیروی کرتے اُن کی طرف سے دیئے گئے الٰہی احکامات کی پیروی کریں اور اس مقصد کے لئے اُنہیں جس قدر بھی کوشش اور زحمت کرنی پڑے کریں تاکہ الٰہی تعلیم وتربیت کے ذریعے وہ انسانیت کے مطلوبہ مقام ومرتبے تک پہنچ سکیں۔ کیونکہ انسانی جبلتوں کی سرکشی، ظلمت وجہالت اور نفسانی خواہشات کو صحیح اور الٰہی تربیت کے بغیر کسی اور طریقے سے مہار نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا صحیح تربیت انسان کی بنیادی ترین ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”يَا أَسْرَى الرَّغْبَةِ أَقْصِرُوا فَإِنَّ الْمُعَرِّجَ عَلَى الدُّنْيَا لَا يَرُوعُهُ مِنْهَا إِلَّا صَرِيفُ أَنْيَابِ الْحِدْثَانِ أَيُّهَا النَّاسُ تَوَلَّوْا مِنْ أَنْفُسِكُمْ تَأْدِيبَهَا وَ اعْدِلُوا بِهَا عَنْ ضَرَاوَةِ عَادَاتِهَا “

یعنی: ''اے حرص و طمع کے اسیروں ! باز آجاؤ کیونکہ دنیا پر ٹوٹنے والوں کو حوادث زمانہ کے دانت پیسنے ہی کا اندیشہ کرنا چاہیے۔اے لوگو! خود اپنی اصلاح کا ذمہ لو اور اپنی عادتوں کے تقاضوں سے منہ موڑ لو۔'' (3)

اسی طرح امام علیہ السلام اُن لوگوں کی تربیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جو دوسروں کی پیشوائی اور تربیت کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا فرماتے ہیں:

''مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ إِمَاماً فَلْيَبْدَأْ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ غَيْرِهِ وَ لْيَكُنْ تَأْدِيبُهُ بِسِيرَتِهِ قَبْلَ تَأْدِيبِهِ بِلِسَانِهِ وَ مُعَلِّمُ نَفْسِهِ وَ مُؤَدِّبُهَا أَحَقُّ بِالْإِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَ مُؤَدِّبِهِمْ۔''

یعنی: ''جو لوگوں کا پیشوا بنتا ہے تو اُسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے کو تعلیم دینا چاہیے اور دوسروں کو زبان سے درس اخلاق دینے سے پہلے اپنی سیرت و کردار سے تعلیم دینا چاہیے اور جو اپنے نفس کی تعلیم وتادیب کرلے، وہ دوسروں کی تعلیم وتادیب کرنے والوں سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔'' (4)

## امام خمینیؒ اور انسانی تربیت کی ضرورت

انسان کی حقیقت، ایک ملکوتی حقیقت ہے اور انسان بہت سے مراتب طے کرنے کے بعد تنزل کرتے ہوئے اس خاکی مرتبے تک پہنچا ہے اور پست ترین مراتب پر آکر رکا ہے، لیکن تربیت کے ذریعے وہ اپنی حقیقت ملکوتی کو پاسکتا ہے اور الٰہی صفات اور کمالات کو حاصل کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اسی حالت کی یاددہانی کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ۔''

یعنی: ''بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے۔ پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لئے ختم نہ ہونے والا (دائمی) اجر ہے۔'' (5)

امام خمینیؒ انسانی تربیت کے مراحل کے بارے میں کہتے ہیں:

''انسانی تربیت کے مراتب عالم طبیعت سے مافوق طبیعت تک ہیں، یہاں تک کہ وہ مقام الوہیت تک جاپہنچتا ہے۔ عالم طبیعت سے لے کر ایسے مقام تک انسان مراحل طے کرسکتا ہے کہ جس کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ مخلوق (انسان ) صحیح تربیت کے ذریعے اس عالم طبیعت سے نکل کر معنویات (کے تمام بلند ترین مقامات ) کو حاصل کرسکتی ہے اور خلیفۂ الٰہی کے مقام تک پہنچ سکتی ہے۔'' (6)

حضرت امام خمینیؒ کے افکار اور بیانات میں انسان کی اس ضرورت کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے اور انسان کو تعلیم وتربیت کا محتاج قرار دیا گیا ہے۔ امام خمینیؒ ایک فیلسوف ہیں اور وہ انسان کو اُن مخلوقات میں سے قرار نہیں دیتے جو اپنی ماہیت میں اور اپنی کیفیت و کمیت کے اعتبار سے بنی بنائی خلق ہوتی ہیں، بلکہ دوسرے فلاسفہ کی مانند امامؒ کے نزدیک بھی انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنی ماہیت میں تربیت کی محتاج ہے اور جسے اس دنیا میں رہ کر کمال کی منازل طے کرنی ہیں اور اپنے اندر تحول و تبدل کے ذریعے تکامل کا راستہ طے کرنا ہے۔ لہٰذا انسان اپنی پیدائش کے بعد تربیت اور تعلیم کا محتاج ہے اور اُسے کسی ایسے مربی کی ضرورت ہے جو اس کی تکامل کے راستے کی طرف رہنمائی کرے۔ امام خمینیؒ کی مختلف تحریروں اور بیانات میں انسان کی اس ضرورت کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں اور امامؒ اپنے بیانات میں تمام انسانوں کے لئے تعلیم وتربیت کی ضرورت پر تاکید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

## انسان، علم وتربیت کا محتاج ہے

انسان کے اندر بالقوہ کمالات ہیں، جن کو کشف کرنے اور نکھارنے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت تعلیم وتربیت ہی کے ذریعے پوری ہوسکتی ہے اور تربیت کے ذریعے انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں نکھر سکتی ہیں۔ اور پھر انسان کی فطرت میں ان تمام کمالات کی طرف راہنمائی بھی موجود ہے کہ جن کی ہر ایک انسان کو ضرورت پڑتی ہے، البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان ان کمالات کو مرتبہ بالقوہ سے مرتبہ بالفعل تک پہنچانے کیلئے کوشش اور جدوجہد کرے۔انسان کی اسی فطری صلاحیت کی وضاحت کرتے ہوئے امام خمینیؒ کہتے ہیں:

"اس عالم ہستی سے تعلّق رکھنے والے تمام موجودات میں صرف انسان ہی کو کچھ خصوصیات حاصل ہیں کہ جو دوسرے تمام موجودات کو حاصل نہیں۔ ایک خصوصیت اس کی باطنی دنیا ہے۔ دوسری خصوصیت اس کا عقلمند ہونا ہے اور اس کی عقل سے بڑھ کر اس کی ایک اور خصوصیت بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں تمام کمالات بالقوہ ہیں۔ اس کی فطرت میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ انسان اس فطرت کے سائے میں اس عالم ہستی کی سیر کرے اور اس مقام تک پہنچے کہ جہاں ہمارا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ان مدارج کو طے کرنے کیلئے انسان تربیت کا محتاج ہے۔" (7)

امام خمینیؒ انسان کی اسی ضرورت کے پیش نظر تعلیم بالغاں اور ریڈ کراس کے عہدہ داروں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" آپ جن کو تعلیم دے رہے ہیں انشاء اللہ کہ آپ کامیاب ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی تربیت سے غفلت کریں۔ تربیت سے غافل نہ رہیں۔ انسان نصیحت کا محتاج ہے، تربیت کا محتاج ہے۔ جب تک زندہ ہے تربیت و نصیحت کا نیاز مند ہے۔ علم کو تربیت کے ساتھ (ملادیں) یہ دو پر ہیں کہ انسان ان دونوں کے ساتھ ہی خدا کی جانب سفر کر سکتا ہے۔" (8)

حوزہ علمیہ قم کے اساتذہ کے مرکزی ادارے جامعہ مدرسین کے اعضاء اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بھی امامؒ انسان کی اس بنیادی ضرورت پر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ملک آیندہ ایک نورانی ملک ہو تو ان (جوانوں) کی تربیت کریں جو دینی حوزوں اور مراکز میں ہیں یا جہاں پر آپ درس دے رہے ہیں اور جو ادھر داخل ہوئے ہیں۔ ان کی ایسی تربیت کریں کہ وہ اس عالم (مادی) سے ہجرت کریں اور یہاں کے ماورائے مادیت پر توجہ دینے لگیں، روحانی بن جائیں، یعنی خود روح ہو جائیں یعنی ماورائے طبیعت کی طرف توجہ رکھتے ہوں۔ شروع سے ہی جو قدم اٹھایا جائے اسی عالم (روحانیت) کی طرف اٹھایا جائے۔ جب ایسا ہو گا تو دنیا کے معاملات بھی صحیح ہو جائیں گے۔ وہ شخص جو اپنے معنوی پہلوؤں کی تقویت کرلیتا ہے وہ شخص طبیعی پہلوؤں میں بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔" (9)

## عدم اصلاح کی صورت میں نابودی

امام خمینیؒ حوزہ علمیہ نجف اشرف میں دینی طلاب کو درس اخلاق دیتے ہوئے انسانی تربیت کی ضرورت پر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں اب اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہوں اور جلد یا دیر آپ کے درمیان سے چلا جاؤں گا، لیکن اگر آپ نے اپنی اصلاح نہیں کی تو تاریک مستقبل اور سیاہ دنوں کی آپ کیلئے پیشنگوئی کررہا ہوں۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو اخلاقی طور پر مہذب نہیں بنایا، اگر آپ نے اپنی زندگی اور درس و تعلیم میں نظم وضبط کو حاکم نہیں بنایا تو آنے والے وقت میں آپ خدانخواستہ نابود وفنا ہو جائیں گے۔'' (10)

## نفس کی تربیت نہ کرنے کے نتائج

انسان اگر اپنی اس فطری ضرورت (یعنی تربیت) کی طرف توجہ نہ دے تو اسے خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ دنیا وآخرت کے خسارے سے دوچار ہو جاتا ہے، بے تربیتی کے ان شوم نتائج کی طرف امامؒ یوں اشارہ کرتے ہیں:

''اگر ہم صراط مستقیم پر قدم نہ اٹھائیں، اپنے نفس اور معلومات کو مہار نہ کریں اور اس راہ میں اپنی نفسانی خواہشات کا گلا نہ گھونٹیں تو علم جتنا بھی زیادہ ہوتا جائے گا انسان، انسانیت سے دور ہوتا چلا جائے گا اور ایسی صورت میں انسان کا صراط مستقیم کی طرف لوٹنا مشکل تر ہو جائے گا۔'' (11)

مادی ومعنوی دونوں پہلوؤں میں تربیت کی ضرورت پر تاکید کرتے ہوئے امام خمینیؒ بابل شہر کے ورزش کاروں اور تعلیمی عملہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' جس طرح انسانوں کے معنوی پہلوؤں کے لئے کچھ تعلیمات ہیں اسی طرح ان کے ظاہری اور مادی زاویوں کے لئے کچھ تعلیمات ہیں۔ اگر یہ دونوں آپس میں جمع ہو جائیں تو انسان حقیقی معنیٰ میں انسان بن جاتا ہے۔ میں اس بات سے خوش ہو کہ کچھ حضرات معنوی جہات کی تقویت کر رہے ہیں اور کچھ افراد مادی تقاضوں میں تربیت دے رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ مادی ومعنوی دونوں پہلوؤں کو جمع کر پائیں گے۔ آپ محترم اساتذہ !ان

عزیز ورزش کاروں کی ان دونوں پہلوؤں کی تقویت کریں۔ اسی طرح ملک کے تمام لوگوں میں اگر ان دونوں پہلوؤں کی تقویت ہوجائے۔ معنوی پہلو ان معنوی تعلیمات کے ذریعے جو اسلام لے آیا ہے اور مادی پہلو کی ان ہی طریقوں کے تحت جو ضروری ہیں تو یقیناً یہ قوم سعادت مند ہوجائے گی۔" (12)

## زمانہ طفولیت سے تربیت کا آغاز

انسانی تربیت کا آغاز انسان کے بچپن سے ہوتا ہے، اور انسان کی تربیت کا بہترین زمانہ بچپن ہی ہے اگر بچپن میں انسان کی تربیت نہ ہو تو جوانی اور بڑھاپے میں تربیت بہت مشکل ہوجاتی ہے، اسی لئے دینی تعلیمات کے مطابق بچپن انسان کی تربیت کا بہترین زمانہ ہے اسی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام خمینیؒ دینی اساتذہ کی ایک نشست سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آپ اگر ان بچوں کی اس طرح تربیت کرسکیں کہ روز اول سے ہی وہ خدا کی رضا مد نظر رکھنے والے بن جائیں اوران کی توجہ خدا کی طرف ہوجائے۔ تو آپ ان بچوں کے اندر خدا کی عبودیت اور خدا سے تعلق پیدا کردیں گے، کیونکہ بچے ان باتوں کو جلدی اپنالیتے ہیں۔ اگر آپ نے خدا کی بندگی، دینی تربیت اور جو کچھ خدا کی جانب سے ہے، ان کو سمجھا دیا اور یہ انہیں اپنالیں تو آپ (سمجھ لیجئے کہ) آپ نے معاشرے کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔" (13)

ایک دوسری جگہ نوجوانوں کی تربیت کے لازمی ہونے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پہلی بات تو یہ ہے کہ (آپ ایسی تربیت کریں) کہ ہمارے یہ نوجوان اچھے اور نیک بن جائیں۔ یہ نوجوان جو مستقبل میں اس مملکت کے نگہبان اور اسے چلانے والے ہیں تو لازمی ہے کہ ان کی صحیح تربیت اور اصلاح کی جائے۔" (14)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"نوجوان جو عالم ملکوت کی طرف پرواز کیلئے پر عزم اور باحوصلہ ہوتے ہیں اور ان کے نفوس دوسروں سے زیادہ پاک ہوتے ہیں، چنانچہ اگر وہ تہذیب نفس کے لئے کوشش نہ کریں اور (معنوی) تربیت کے مطابق زندگی نہ گزاریں تو وہ ہر قدم جو اپنی منزل کی طرف

اٹھائیں گے اور ان کی زندگی کا آفتاب جتنا جتنا اپنے غروب کی طرف سفر کرتا جائے گا تو نہ صرف یہ کہ وہ ملکوت اعلیٰ سے دور ہوتے جائیں گے، بلکہ ان کے قلوب پر کدورتوں کی تہہ دبیز ہوتی جائے گی۔ چنانچہ تربیت کو ابتدا ہی سے شروع کرنا چاہیے اور زمانہ طفولیت سے ان کو پاکیزہ انسانوں کی تربیت کے زیر سایہ اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے۔ زمانہ طفولیت کے بعد بھی یہ نوجوان جہاں جائیں ایک تہذیب یافتہ مربی کے زیر تربیت رہیں۔ چونکہ انسان اپنی زندگی کے آخری لمحات تک تربیت کا محتاج ہے۔"(15)

## انبیائے کرامؑ اور انسانی تربیت کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ انسان کی تربیت کرکے اُسے اپنے مطلوبہ کمال تک پہنچائیں۔ لہٰذا امامؒ کے نزدیک انسان کو انبیائے کرام کی تربیت اور تعلیم سے بہرہ مند ہونا چاہیے اور کسی بھی صورت اُن الٰہی انسانوں کی تعلیمات سے منہ نہیں موڑنا چاہیے:

"یہ طاغوتی اور شیطانی مخلوق (انسان) اگر انبیاء کے سائے تلے پروان نہ چڑھے اور ان کی تعلیم وتربیت کے مطابق زندگی نہ گزارے تو اس شخص میں اور اس شخص میں کوئی فرق نہیں کہ جو عملاً دنیا کو لوٹ رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ لوٹ مار اس کے امکان سے باہر ہے اور وہ عملاً لوٹ رہا ہے۔"(16)

ایک دوسری جگہ ( بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکارِمَ الأَخْلاق) کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اور انسانوں کی تربیت میں انبیائے کرام کے بنیادی کردار کے بارے میں فرمایا: "خدا کے پیغمبر اس لئے مبعوث ہوئے ہیں کہ آدمی کی تربیت کریں، انسان کو انسان بنائیں۔ بشر کو برائیوں، گندگیوں، فساد اور اخلاقی رذائل سے دور کردیں اور فضائل اور آداب حسنہ سے آشنا کریں۔"(17)

ہر عالم اور دانشمند کسی نہ کسی موضوع کے بارے میں بحث وگفتگو کرتا ہے اور ہر ایک علم کا ایک موضوع ہوتا ہے، اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے امام خمینیؒ انبیائے کرامؑ کے علم کے موضوع کے بارے میں کہتے ہیں:

''اگر ہر علم کا کوئی موضوع ہے... تو تمام انبیاء کے علم کا بھی موضوع انسان ہے... وہ آئے ہیں تاکہ انسان کو تربیت دیں۔آئے ہیں تاکہ اس طبیعی موجود کو مرتبہ طبیعت سے ماورائے طبیعت کے عالی مرتبے اور مافوق الجبروت تک پہنچا دیں۔'' (18)

## تربیت کے بغیر انسان کا بے لگام ہونا

اگر انسان کی تربیت نہ ہو اور وہ کسی مربی کے زیر سایہ زندگی کے آداب نہ سیکھے تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہو سکتا ہے، جس کی مثالیں ہماری معاصر دنیا میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک بے تربیت انسان معاشروں کو جس قدر نقصان پہنچاتا ہے، اس قدر کوئی حیوان اور درندہ بھی نہیں پہنچاتا۔ انسان کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

''انسان پہلے ایک حیوان ہے، بلکہ حیوانات سے زیادہ بدتر۔ اگر انسان اپنی خواہشات نفسانی کے سائے میں پروان چڑھے اور یونہی آگے بڑھے تو درندگی، شہوت اور شیطنت میں کوئی حیوان انسان کے مثل نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے حیوانات کی شیطنت، شہوت اور درندگی محدود ہے۔ انسان ایک ایسا موجود ہے جو اپنی خلقت کے اعتبار سے دیگر تمام موجودات سے بالاتر مقام کا حامل ہے لیکن دوسری طرف اس کی شہوت، غیض و غضب اور شیطنت ہے کہ ان کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ (فرض کریں کہ) ایک انسان اگر ایک گھر کا مالک بن جائے تو وہ دوسرے گھر کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔ اگر پوری دنیا اس کے قبضہ قدرت میں ہو تب بھی وہ اس فکر میں ہے کہ چاند پر بھی قبضہ کرلے اور مریخ پر بھی تسلّط جمالے۔ نہ اس کی ہوس کی کوئی حد ہے اور نہ اس کی شہوت کی کہ ایک مقام پر جا کر سیر ہو جائے۔ ایک مقام مل جائے تو دوسرے مقامات کی تلاش میں، دس مرتبے مل جائیں تو سو کی تلاش میں سرگردان رہتا ہے اور نہ اس کی لالچ کا دریا آرام پانے والا ہے کہ ایک ملک، دو ملک اور دس ممالک پر قانع ہو جائے۔ انبیاء اسی لیے آئے ہیں کہ اس کی خواہشات کو محدود کریں، یعنی اسے لگام دیں۔ یہ بے لگام حیوان کسی بھی محدودیت کا قائل نہیں ہے۔ انبیاء

اگر اسے آزاد چھوڑ دیں اور اس کی تربیت نہ کریں تو اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ تمام چیزوں کو اپنے لیے ہی چاہتا ہے اور تمام چیزوں کو اپنے مقصد کیلئے قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ انبیاء کی آمد کا مقصد یہی ہے کہ اس بے لگام حیوان کو لگام دیں اور قوانین کے زیر سایہ لے آئیں اور جب یہ قابو میں آجائے تو اسے راہ ہدایت دکھائیں تاکہ اس کی صحیح تربیت ہوسکے، ایک ایسی تربیت کہ جس کے ذریعہ سے وہ اپنے ممکنہ کمالات کی آخری منزل کو پاسکے کہ جو ہمیشہ اس کیلئے سعادت ہے۔" (19)

## اختلاف ونزاع کی وجہ

انسانی معاشروں میں اختلاف اور نزاع کی سب سے بڑی وجہ انسان کا بے تربیت ہونا ہے، ایک مہذب انسان کبھی بھی اختلاف اور نزاع کی وادی میں قدم نہیں رکھتا۔ امام خمینیؒ کے نزدیک انسانوں کی تمام مشکلات کا سبب اُن کا بے تربیت اور غیر مہذب ہونا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اگر ہم اپنی تربیت کرلیں تو ہماری تمام مشکلات دور ہوجائیں گی۔ ہماری تمام تر مشکلات اسی لیے ہیں کہ ہماری تربیت نہیں ہوئی ہے اور ہم خدا کی پسندیدہ تربیت اور اسلام کے پرچم تلے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ دراصل یہ تمام اختلافات ونزاع جو آپ دیکھ رہے ہیں اور ہماری قوم کے خلاف ہونے والی یہ تمام سازشیں یہ سب صرف اسی لیے ہیں کہ (انسان کی) نہ تو تربیت کی گئی ہے اور نہ تزکیہ وتہذیب نفس۔" (20)

## پوری اُمت مسلمہ کو تربیت کی ضرورت ہے

امام خمینیؒ نے دنیا کے بے تربیت انسانوں کے خلاف قیام کیا ہے تاکہ وہ اپنی قوم اور ملت کو اسلامی اور الٰہی تربیت کے سائے میں پروان چڑھائیں اور اُنہیں دنیوی اور اُخروی سعادت کا راستہ دکھائیں، وہ اسلامی جمہوریہ کے قیام کا سب سے بڑا مقصد اپنی قوم وملت کی تربیت وتزکیہ قرار دیتے ہیں اور پوری ایرانی قوم بلکہ پوری اُمت مسلمہ کی الٰہی تربیت پر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلامی جمہوریہ (ایران) کو بھی (معنوی) تربیت اور تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ ہماری قوم کے تمام طبقات اور تمام اقوام عالم، (معنوی) تربیت اور تزکیہ نفس کے محتاج ہیں اور ان سب کو انبیاء کی بلند پایہ تعلیمات کی ضرورت ہے۔" (21)

## سب سے بڑا شیطان، نفس کا شیطان ہے

امامؒ بحیثیت معلم اخلاق، انسان کے نفس کو انسان کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور اُسے اپنے نفس امارہ پر قابو پانے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ نفس امارہ کو قابو میں رکھنے اور مہار کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ تربیت ہے، وہ بھی الٰہی اور دینی تربیت۔ تربیت یافتہ انسان اور تزکیہ نفس کے مراحل سے گذارا ہوا انسان کبھی بھی نفس امارہ کے چنگل میں نہیں پھنستا اور نہ ہی نفس کے شیطان سے مغلوب ہوتا ہے۔ اس مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اگر اسے لگام نہ دی جائے، اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق پروان چڑھے اور ایک جنگلی گھاس کی مانند گلستان حیات میں قدم رکھے یا پھر اس کی تربیت نہ ہو تو وہ ماہ وسال کی جتنی بھی سیڑھیاں چڑھے گا یا مقام ومنصب کے جتنے بھی درجات طے کرے گا وہ روحانی طور پر تنزل ہی کرتا رہے گا اور اس کی معنویت اور باطنی دنیا، شیطان اکبر جو نفس کا شیطان ہے، کے تصرف واختیار میں چلی جائے گی۔" (22)

## تعلیمی نصاب میں اخلاق کا سر فہرست ہونا

انسانوں کی تربیت کے لئے نصاب کی ضرورت ہے، ایسا نصاب جو انسان کو بچپن ہی سے انسان بنائے اور اس کی تہذیب نفس کا راستہ ہموار کرے۔ کسی قوم وملت کا نصاب اُس کی تربیت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اگر تعلیم وتربیت کا نصاب انسانی قدروں اور اخلاقی معیار کے مطابق نہ ہو تو وہ قوم مہذب نہیں بن سکتی۔ یہ غلط نصاب اور اخلاق قدروں سے گرا ہوا نظام تعلیم ہی تھا جس کی وجہ سے انقلاب اسلامی سے پہلے کی ایرانی قوم اغیار کی غلام بنی ہوئی تھی، لیکن انقلاب اسلامی کے بعد نصاب میں بنیادی تبدیلیوں نے تیس دہائیوں کے بعد ایرانی قوم کو دنیا کی سربلند ترین اقوام میں لا کھڑا کیا ہے۔ امام خمینیؒ، شاہی دور کے نصاب کی خامیاں بیان کرنے کے بعد اسلامی تربیت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"اسلام اور ہماری مملکت نے ان افراد کے قلم وزبان سے جو اسلام کے پابند نہیں تھے اور منحرف تھے، اتنے نقصانات اٹھائے ہیں کہ جتنے اسلحے، محمد رضا (شاہ ایران) اور اس کے باپ سے بھی نہیں اٹھائے۔ یہ تمام نقصانات معنوی اور روحانی ہیں اور روحانی ومعنوی نقصان مادی وجسمانی ضرر سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اگر کسی صاحب علم نے اپنا تزکیہ نفس نہ کیا ہو، اگرچہ وہ اسلامی احکامات کا عالم ہی کیوں نہ ہو، اگرچہ وہ علم توحید ہی کا عالم کیوں نہ ہو، اگر اس نے تہذیب نفس نہ کی ہو تو وہ خود اپنے لیے، اپنے ملک وملت اور اسلام کیلئے نہ صرف یہ کہ سودمند نہیں، بلکہ الٹا نقصان دہ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلام اور اپنی قوم کی خدمت کریں اور استعماری طاقتوں اور ان سے وابستہ افراد کے غلام نہ ہوں تو یونیورسٹی، مدرسہ فیضیہ (اور بالعموم تمام دینی مدارس) اور ان دونوں تعلیمی اداروں سے منسلک افراد کے علمی نصاب میں اخلاقی تعلیمات اور تہذیب نفس کو سرفہرست قرار دیں تاکہ مرتضٰی مطہری (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے افراد معاشرے کو پیش کر سکیں۔ اگر خدانخواستہ اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو اس وقت ان نیک شخصیات کی متضاد شخصیات معاشرے کے حوالے کی جائیں گی اور وہ معاشرے کو برائی اور عوام کو غلامی کی طرف لے جائیں گے۔" (23)

*****

# حوالہ جات


1۔ مرتضی مطہری- آشنایی با قرآن،انتشارات صدرا،۱۴۲۵ھ ج 7- صفحہ 49، تہران

2۔ سورۂ جمعہ ،آیت ۲

3۔ سید رضی، نہج البلاغہ (اردو ترجمہ مفتی جعفر حسین)، حکمت :۵۹،ادارۂ نشر معارف اسلامی،لاہور

4۔ سید رضی، نہج البلاغہ ،(اردو ترجمہ مفتی جعفر حسین)، حکمت : ۷۳،ادارۂ نشر معارف اسلامی،لاہور

5۔ سورۂ تین،آیت ۴۔۶

6۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ نور، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی ۱۳۷۱ش،ج ۶، ص ۲۸۲، تہران

7۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۴، ص ۱۷۵، تہران

8۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۷، ص ۱۸۶، تہران

9۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۹، ص ۳۵۶، تہران

10۔روح اللہ، خمینی، جہاد اکبر یا مبارزہ با نفس، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۶۸ش ص ۶۱، تہران

11۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش ج ۹، ص ۴، تہران

12۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش ج ۸، ص ۲۲۲، تہران

13۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش ج ۱۴، ص ۴۰، تہران

14۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش ج ۱۰، ص ۴۳۹، تہران

15۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش ج ۱۴، ص ۱۵۳، تہران

16۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۹، ص ۱۳، تہران

17۔روح اللہ، خمینی، جہاد اکبر یا مبارزہ با نفس، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۶۸ش ص ۱۲، تہران

18۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۸، ص ۳۲۴، تہران

19۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۱، ص ۴۴۹، تہران

20۔روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۳، ص ۵۰۷، تہران

21۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۳، ص ۵۰۸، تہران
22۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۴، ص ۱۶۹، تہران
23۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج ۱۴، ص ۱۵۲، تہران

# ذرائع ابلاغ کا آغاز وارتقاء اور عصری اہمیت

(ایک تحقیقی مطالعہ)

ڈاکٹر محمد ریاض*
dr.riazrazee@gmail.com

**کلیدی کلمات:** ذرائع ابلاغ، عصری اہمیت، آغاز وارتقاء، انسانی محنت، اکیسویں صدی، ابلاغی مناہج

## خلاصہ

ذرائع ابلاغ کی دریافت انسانی محنت کا تسلسل اور ضرورت کے تحت معرضِ وجود میں آنے والا شاندار کارنامہ ہے۔ ان کی پیدائش کا تعلق اگرچہ انسان کی شروعاتی زندگی سے ہے تاہم جدیدیت کا نیا روپ اکیسویں صدی میں سامنے آیا۔ جس طرح دیگر شعبہ ہائے زندگی مثلاً رہن سہن، طرزِ زندگی، بول چال، سیاست، معیشت اور مختلف کاروبارِ زندگی میں جدت آئی ہے، بعینہٖ آج ذرائع ابلاغ کے مناہج میں بھی جدیدیت کا عنصر نمایاں نظرآرہا ہے۔ قدیم ابلاغ کی وضعی اور عملی ہیئت کا دائرہ کار محدود تھا۔ خاندان، قبیلہ، قوم، گاؤں کے افراد ابلاغ کے ابتدائی سامعین، شاہدین اور ناظرین شمار ہوتے تھے۔
جبکہ ابلاغی مناہج میں اشارے کنایئے، علامتی تصاویر (مجسمے)، بول چال، اجتماعات، میلے اور تحریر و تقریر جیسے عناصر شامل تھے۔ بیسوی صدی کے اوائل تک اس شعبے کو صحافت کے نام سے جانا جاتا تھا۔ البتہ دعوت، تبلیغ، ابلاغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تقاریر، خطبات جیسے نام بھی انفرادیت کے طور پر بھی استعمال کئے جاتے رہے۔ مندرجہ بالا صدی کے اختتام تک برقیاتی آلات نے اس کی جدت میں خاصا اضافہ کردیا، نہ صرف اس کی ہیئت بدل گئی بلکہ مختلف ناموں کے بجائے ایک ہی نام یعنی ذرائع ابلاغ سے اس کی شناخت عام ہوئی۔ زیر نظر مقالہ میں ذرائع ابلاغ کو لغوی واصطلاحی تناظر میں بیان کرتے ہوئے آغاز وارتقاء اور اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔

*۔ پی ایچ ڈی، جامعہ کراچی

## اِبلاغ... لغوی مفہوم

ابلاغ کا مادہ" بَلَغَ۔ب ل غ" ہے اور لفظ"بلغ" (بَلَغَ یَبْلُغُ اَلْبَلَغْ) فعل ثلاثی مجرد (1) سے ہے جو کہ نَصَرَ یَنْصُرُ کے وزن پر آتا ہے۔اِبلاغ الف بمع کسرہ باب افعال (2) کا مصدر ہے اور ثلاثی مزید فیہ (3) سے ہے۔ جیسے: اَبْلَغَ یُبْلِغُ اِبْلاغاً اسی طرح ثلاثی مزید فیہ سے ہی باب تفعیل (4) کے وزن پر بھی آتا ہے: بَلَّغَ یُبَلِّغُ تَبْلِیْغاً۔ اِبْلاغ، تَبْلِیْغ ،اَلْبَلاغ ،اَلْبَلَغ،ہر صورت میں اس کا معنی ایک ہی ہے یعنی پیغام کی ترسیل۔(5)(6)البتہ لفظ تبلیغ کے معنی بہت اچھی طرح سے پہنچادینے کے ہیں۔ابن منظور (متوفی ۱۳۱۱ھ) کے نزدیک:

وان کانت الروایۃ من البلاغ بفتح الباءِ فلہ وجھان: أحدھما ان البلاغ ما بلغ من القرآن والسنن، والوجہ الآخر من ذوی البلاغ أی الذین بلغونا، یعنی ذوی التبلیغ (7)

اگر لفظ بلاغ کے" با" پر زبر ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک وہ چیز ہے جو قرآن و سنت کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، دوسری قسم سے مراد صاحبِ تبلیغ ہیں یعنی مبلغ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ہمیں تبلیغ کی، یعنی صاحبِ تبلیغ۔

بلاغ کا معنی مقصد اور غرض و غایت کی آخر حد تک پہنچادینا ہے۔ جیسا کہ راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے بیان کیا ہے: البلوغ و البلاغ الانتھاءُ الی أقصی المقصد (8) المنجد میں بھی لگ بھگ یہی معنی بیان ہوا ہے تاہم صاحبِ منجد نے اس مفہوم کو وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔ان کے نزدیک ہر وہ چیز جس کو انتہا درجہ تک پہنچادیا گیا ہو، بلاغ کہتے ہیں۔(9) بلاغ کے ایک معنی کافی ہو جانا بھی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: إِنَّ فِی ھَذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِینَ (10) "بے شک اس (قرآن) میں عبادت گزاروں کیلئے (حصولِ مقصد کی) کفایت و ضمانت ہے۔"

فصاحت پر مبنی کلام کو بھی بلاغت (بلاغ) کہتے ہیں اور بلاغتِ کلام یہ ہے کہ الفاظ کے مفردات اور پورا جملہ فصاحت کی شرائط کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ تقاضائے حال کے مطابق بھی ہو۔(11) مذکورہ کلام

سے واضح ہوتا ہے کہ مکمل اور جامع ابلاغ کیلئے دو بنیادی باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ (الف) پیغام مبنی بر فصاحت ہو اور (ب) ترسیل کیا جانے والا پیغام زمانہ حال کے مطابق ہو۔

واضح رہے کہ لفظ اِبلاغ (الف بمع کسرہ) قرآن مجید میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا، تاہم بلغ، البلاغ، بلاغ، بلاغاً جیسے الفاظ ترسیلی مفہوم کیلئے وضع ہوئے ہیں۔ اعدادی ترکیب کے لحاظ سے لفظ بلغ دس مرتبہ، البلاغ گیارہ مرتبہ، بلاغ دو مرتبہ (سورہ ابراہیم ۵۲، سورہ الاحقاف: ۳۵)، بلاغاً ایک مرتبہ (سورہ جن: ۲۳) آیا ہے۔ قرآن مجید میں تبلیغ کیلئے دیگر کئی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے انذار، تبشیر، تخویف، ہدایت، ارشاد، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ۔ (12)

درج بالا لغوی بحث کے تناظر میں یہ معلوم ہوا کہ ابلاغ فی نفسہ پہنچانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ مزید بحث (اسلامی نقطہ نظر سے) اس جہت پر ہونا باقی ہے کہ آیا ہر پہنچائی جانے والی بات ابلاغ کے زمرے میں آتی ہے یا صرف انہی مفاہیم کو ابلاغ کہیں گے جن سے کوئی ہدف یا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔

## اِبلاغ... اصطلاحی مفہوم

جدید ابلاغی ہیئتِ مجموعہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی واقعہ کو تحقیقی مراحل سے گزارنے کے بعد صوتی (آواز)، بصری (آنکھ)، تحریری (کتب و اخبار) یا علامتی (اشارہ کنایہ، مجسمے وغیرہ) شکل میں سامعین، ناظرین، قارئین اور شاہدین تک پہنچانے کا نام ابلاغ ہے۔ یہ تعریف بحث و تحقیق، تبصرہ و تجزیہ سے بالاتر ظاہراً نظر آنے والے ابلاغی ذرائع کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ تاہم بامقصد اور با مراد ابلاغ کیا ہے اور کن حالات میں اس کی وضعی ہیئت کیا ہونی چاہیے، ان نقاط کو ماہرین کی آراء میں پیش کیا جارہا ہے۔

ابوالقاسم حسن بن محمد المعروف بہ راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں:

والبلاغة تقال على وجهين: احدهما أن يكون بذاته بليغا و ذالك بان يجمع ثلاثة اوصاف صوابا فى موضوع لغته و طبقا المعنى المقصود به وصدقا فى نفسه ومتى اخترم وصف من ذالك

كان ناقصا في البلاغة، والثاني: أن يكون بليغا باعتبار القائل والمقول له وهو أن يقصد القائل أمراً فيرده على وجهٍ حقيق أن يقبله المقول له (13)

البلاغ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے ایک یہ کہ وہ کلام بذات خود بلیغ ہو اور اس کیلئے تین اوصاف کا ہونا شرط ہے۔ (الف) وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، (ب) معنی مقصود کے مطابق ہو، (ج) کلام فی الواقع سچا ہو، اگر ان اوصاف میں کسی ایک وصف کی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ یعنی متکلم اور مخاطب کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مافی الضمیر کو خوبی سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے۔

شیخ محمد بن حسن طوسیؒ (متوفی ۴۶۰ھ) کے نزدیک:

"والبلاغ وصول المعنى الى غيره، وهو هاهنا وصول الانذار الى نفوس المكلفين" (14)

البلاغ کسی معنی (امر) کو اپنے سے غیر تک پہنچانے کو کہتے ہیں (البتہ اسلامی نقطہ نظر سے) البلاغ کے معنی تکلیف شرعی کے حامل افراد کو (برائیوں) سے خوف دلانے کے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر القادری کے مطابق:

"ابلاغ کسی امر کو اس کے انجام تک پہنچانے کی ایسی جدوجہد کو کہتے ہیں جس میں انجام کے حصول کیلئے تمام مطلوبہ ضروریات کی اس طرح تکمیل کردی گئی ہو کہ پھر انسان کو کسی اور ذریعے کی حاجت نہ رہے۔" (15)

بعض دفعہ ترسیل کی جانے والی بات تحقیقی انداز کا درجہ رکھتی ہے۔ سند اور صداقت دونوں کیفیتوں کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے بعد ازاں پڑھی ہوئی، سنی ہوئی، دیکھی ہوئی بات کو انہی دو معیارات (سند و صداقت) کے تناظر میں قارئین، سامعین اور ناظرین تک پہنچایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آئندہ آنے والی تعریف میں اس طرح کا رنگ نظر آتا ہے:

"وہ قرائتی، سمعی اور بصری ذرائع جن کے ذریعہ حادثات و واقعات، مسائل اور رجحانات و میلانات کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جاتی ہیں، ان کی سند اور صداقت کے بارے میں

تحقیق کی جاتی ہے اور پھر ان کو اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹی وی یا انٹرنیٹ پر نشر کیا جاتا ہے، یہ تمام امور میڈیا (ذرائع ابلاغ) کی تعریف میں آتے ہیں۔" (16)

دو افراد کے خیالی تعلق کو ابلاغ کہتے ہیں۔ بقول ولبر شریم:

"ابلاغ ایک ایسی کوشش کا نام ہے جس کے تحت دو یا دو سے زائد افراد ہم خیالی پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔" (17)

مذکورہ بالا تعریف فنی اعتبار سے تشریح طلب ہے۔ اوپر بیان کی گئیں اکثر تعریفوں میں بامقصد اور بامراد گفتگو ہی کو ابلاغیات کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ ہر خیالی سوچ کو ابلاغ قرار دینا غیر ضروری طور پر مفہوم کو طول دینے کے مترادف ہوگا۔ دوسری جانب خیالی تعلق باہمی بات چیت اور گفتگو سے ہی ہوتا ہے۔ صرف خیال اور ذہنی تعلق کو ابلاغ قرار دیا جائے تو پھر یہ روحانیت کے زمرے میں چلا جائے گا۔ جبکہ ہماری پوری گفتگو کا تمام تر انحصار ظاہری ابلاغ (بات چیت) تک محدود ہے۔

لفظ صحافت بیسوی صدی کے اوائل اور وسط تک عمومی طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ چونکہ تمام ابلاغی ذرائع کا تعلق طباعت سے تھا۔ خاص طور پر برقیاتی ابلاغ کی ایجاد سے قبل صرف تحریری صنف رواج تھی، اس لئے اس شعبے کو صحافت سے ہی جانا گیا۔ یہ لفظ قرآن حکیم سے لیا گیا ہے اور جو کتابیں پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے نمائندگانِ خدا کی طرف سے لکھی لکھائی مل جاتی تھیں انہیں صحیفہ آسمانی کہا گیا اور قرآن حکیم نے ایک مقام پر اس کو صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کہا۔ چونے کے پتھر پر لکھائی سے لے کر کاغذ کے ایجاد تک اپنی طویل تاریخ میں صحافت کا ہمیشہ سے یہی فریضہ رہا کہ وہ خیالات و نظریات کو ظرفیت بخش کر آئندہ زمانے کی طرف منتقل کرتی رہے۔

یہ لفظ عربی سے اُردو میں داخل ہوا اور ثلاثی مجرد کے باب سے اسم مشتق ہے۔ اس کا ماخذ صحیفہ ہے جس کے معنی کتب و رسائل کے ہیں۔ صحیفہ اور صحائف عربی زبان کی ایسے اصطلاحات ہیں جو مقدس کتابوں اور صحیفوں کے قلمی نسخے تیار کرنے والوں کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ اخبار نویسی، مضمون نگاری، رسالہ نگاری، یہ تمام کے تمام پہلو صحافتی زمرے میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام اصناف کتاب کی صورت میں متشکل ہوتی ہیں، اس لئے ان کو صحیفہ کہا گیا۔

ہمارے سامنے اس وقت ایک وسیع و عریض دنیا ہے۔ انسانی آبادی میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے اُسی قدر نت نئی تخلیقات و ایجادات بھی منظر عام پر آرہی ہیں۔ دنیا اپنی وسعت کے اعتبار سے انسان کے دائرہ اختیار سے باہر تھی تاہم جدید برقی آلات (ذرائع ابلاغ) نے اس وسعت کو سمیٹ کر انسان کی ہتھیلی میں رکھ دیا ہے۔ یہ انسانی زورِ محنت کا کمال رہا کہ وہ تحقیق و تدقیق کے ذریعے عجائباتِ عالم کی گہرائی و گیرائی تک پہنچ گیا اور نتیجے کے طور پر دنیا کا تسخیری عمل اس کی مٹھی میں آگیا۔

فضائی تسخیر سے لے کر سمندری عجائبات کی کھوج، سینکڑوں اور ہزاروں میل دور کسی انسان سے صاف وشفاف گفتگو اور معمول سے ہٹ کر رونما ہونے والے کسی بھی واقعہ کے بارے میں آگاہی، جدید زندگی کی قابلِ رشک ایجادات قرار پائیں۔ چونکہ یہ تمام انسانی کوششیں جستجو، تحقیق و تشکیک کے تناظر میں معرضِ وجود میں آئیں تھیں اس لئے جاننا اور مزید کھوج لگانا انسان کا وطیرہ بن گیا۔ خبر گیری، جانکاری، واقعات کی چھان بین اور بعدازاں ان کی تشہیر، یہی وہ نکات تھے جن کی کوکھ سے صحافت نے جنم لیا۔ اب صحافت خبر بن گئی، اطلاع بن گئی، جانکاری بن گئی اور دن بھر کی معلومات کا مکمل خلاصہ بن گئی۔

رہی بات اسلام کی کہ وہ کس قسم کی صحافت کو قبول کرتا ہے یا قبول کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔ اوپر ذکر کئے گئے تمام مفاہیم بطور عمومی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم اسلامی نقطۂ نظر کی بات کرتے ہیں تو یقیناً اس میں کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ کچھ شرائط کے ساتھ صحافت کے طرزِ نگارش کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا بطور مذہب، اسلام نے چند نگارشات کو صحافت کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ من جملہ ان میں سے معتقدات و نظریات کی ترسیل اور سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور تہذیبی شعبہ ہائے حیات کو اسلامی اصولوں اور نظریات کے تناظر میں بیان کرنا صحافت ہے۔

جدید دنیا میں رائج نشریاتی ذرائع کو مختلف نام جیسے میڈیا (Media)، ماس میڈیا (Mass Media)، ماس کمیونیکیشن (Mass Communication) وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اُردو دان طبقہ نے ان آلاتِ نشریات کیلئے جامع اور مفصل اصطلاح ''ذرائع ابلاغ'' وضع کی ہے جو انگریزی میں رائج شدہ تمام ناموں کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ کمیونیکیشن (Communication) کا لفظ لاطینی زبان کے کمیونیس (Communis) سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے، عام (Common)، جب ہم ابلاغ کرتے ہیں تو

درحقیقت ہم کسی کے ساتھ عامیت یا عام پن (Commonness) قائم کرنے کی کوشش کررہے ہوتے ہیں۔(18)

ہماری گفتگو کا تمام تراحاطہ اور رسائی چار عام زبانوں (انگریزی، عربی، اُردو، فارسی) تک ہے لیکن جب ہم دنیا کی دیگر زبانوں کی طرف نظر کرتے ہیں تو ابلاغ یا اس جیسے دوسرے مفاہیم کسی نہ کسی نام سے موسوم ہیں۔ لہٰذا عمومی بات یہ ہے کہ ابلاغ اور ترسیل کا مادہ دنیا کی ہر قوم میں رائج ہے اور وہ اپنے معاشرتی تناظر میں اس جہت کا استعمال کرتی ہے۔

ابلاغِ عامہ کا نظام جو شروعاتی زندگی میں یک طرفہ دیکھتی پہلو کا حامل تھا، دراصل اس کے ارتقائی سفر میں دنیا کی تمام اقوام کا ہاتھ ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ نشاندہی کرسکتے ہیں کہ ابلاغ وترسیل کی ضرورت کے پس پردہ اولین عنصر باہمی میل جول اور تعلقات تھے۔ بعد کے ادوار میں جوں جوں معاشرتی نمو ہوئی مذہب، مسلک، فرقہ اور نظریہ تخلیق ہوا اوران میں سے ہر ایک نظریئے کی ترویج کے لئے دعوت و تبلیغ جیسی مہم بھی ایجاد ہوئی۔ ماضی بعید اور قریب میں مختلف مذاہب نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اس ابلاغی صنف سے کام لیا ہے۔ خود اسلام اپنے وجود سے لے کر اب تک دعوت و تبلیغ کا سب سے بڑا محافظ اور فائدہ اٹھانے والا مذہب رہا ہے۔

درج بالا اقتباسات، تعریفات، نظریات اور افکار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلاغ کی لفظی ہیئت کسی بھی جہت سے ہو، اس سے ایک ہی معنی ظاہر ہوتا ہے یعنی اپنا مافی الضمیر دوسرے لوگوں تک پہنچادینا۔ البتہ بامقصد پیغام سے کیا مراد ہے یہ متعین کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ثقافت، رہن سہن، بول چال یہ دنیا کے تمام انسانوں کی بنیادیں شناخت ہوتی ہیں۔ کسی تحقیق وتدقیق کے بغیر یہ کہنا بجااور درست ہے کہ دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی رہن سہن، بول چال اور ثقافت کی محافظ ہے۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ زندگی کی یہ تین مبادیات شناخت سے بڑھ کر ضرورت کے طور پر ہمیشہ سے انسان کے ساتھ رہی ہیں۔

آغاز سے لے کر اب تک انسان کیلئے ان سے مفر ممکن نہیں ہوا۔ تاہم اس دوران انسان کیلئے یہ ضرور ممکن ہوا کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کے پھیلاؤ کیلئے کوئی ایسا ذریعہ ضرور تلاش کرے جو اس کی شناخت کی وجہ بن سکے۔ غاروں اور جنگلوں کی زندگی، رہن سہن کی ابتدائی شکل تھی۔ اشارے کنایئے، بول چال کے

ابتدائی روپ تھے۔البتہ ثقافت کی مجموعی ہیئت کافی عرصے بعد ترتیب پائی۔ غرض یہ کہ جو جس کی ذہانت تھی، صلاحیت تھی یا ہنر تھا اسی حساب سے اپنی وراثت کو نسلِ نو کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ گویا اس پوری بات چیت کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نے اولین ضرورت کے تحت جس ذریعہ کو اپنی شناخت کی وجہ قرار دیا وہ باہمی میل جول اور اس کے نتیجے میں ترتیب پانے والی معاشرتی زندگی کی اجمالی صورت تھی۔

ابلاغ کو بھی متذکرہ بالا شناختی علامات کے تناظر میں بیان کرنا ہوگا کہ مقصدیت سے کیا مراد ہے؟ طریقہ زندگی، طریقہ تعلیم و تعلّم، طریقہ عبادات و معاملات ہر قوم میں الفاظ کے لحاظ سے یکساں طور پر رائج ہیں، البتہ عملی نفاذ مختلف فیہ ہے۔ مختلف مذاہب، مختلف اقوام اور مختلف مسالک کے طرزِ زندگی، طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے تناظر میں متعین کی جاسکتی ہے کہ ایک قوم، ایک مذہب، ایک مسلک کی نظر میں ابلاغ کا کیا مقصد ہے؟ عبادات و معاملات کی نسل در نسل منتقلی کو ہم بامقصد ابلاغ کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں کیونکہ عبادت کا طریقہ بھلے مختلف ہو، لیکن ہر قوم کی تہذیبی و ثقافتی روایت ہے کہ پس پردہ وہ اچھائی کی حوصلہ افزائی اور برائی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔

اسی طرح علم کی ترویج بھی تمام قوموں کی مشترکہ روایت رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر قوم نے اپنی بساط کے مطابق تبلیغی روش اپنائی، خواہ وہ ثقافت کے پھیلاؤ کی صورت میں ہو، علم کی تشہیر کی صورت میں ہو یا وراثت کی منتقلی کی صورت میں ہو۔ اس سہ جہتی طرز عمل کو ہم بامقصد ابلاغ کہتے ہیں۔ البتہ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک گائیک (گلوکار) اپنے گانوں کی تشہیر کرتا ہے، خوبصورت اور پر سوز آواز میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے تو کیا ایسے پیغامات کو ہم مثبت اور بامقصد ابلاغ کہہ سکتے ہیں؟ یا ایک فن کار اپنے فن کے ذریعے تبلیغ کرتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی تمام بحث کی رو سے ابلاغ اور البلاغ کے مفہوم میں کوئی بھی پیغام شامل ہو سکتا ہے۔ یعنی بامقصد پیغام کی ترسیل سے قطع نظر صرف بات پہنچا دینا ہی ان دونوں الفاظ کے مطمع نظر ہوتا ہے۔ البتہ لفظ تبلیغ جو کہ ایک شرعی اور اسلامی اصطلاح ہے، کے دائرے میں کسی بھی پیغام کو شامل کرنا ذرا مشکل ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لفظ تبلیغ ان مفاہیم کیلئے استعمال ہوتا ہے جو براہ راست اللہ کی طرف سے پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف ودیعت کر دیئے گئے تھے اور وہ تمام فرائض و احکام جن کی ذمہ داری

آپ ﷺ کے کاندھوں پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے تمام پہلوؤں بشمول کلام عظیم قرآن مجید کی تمام آیتیں، سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات، قدیم تاریخی واقعات کا پہنچانا اور اللہ کے پیغام کی تبلیغ کرنا، آپ ﷺ کی پوری ذمہ داری اور منصب داری تھی۔

سطور بالا میں بیان کی گئی ابلاغ کی تمام تعریفات قریب قریب اسلامی اصطلاحات کی رو سے جانی جاتی ہیں۔ ابلاغ، صحافت، دعوت و تبلیغ یہ وہ ذرائع ہیں جو بنیادی طور پر اسلام کی ہی متعارف کردہ اصطلاحیں ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی بھی اصطلاح کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے خلاف ہے۔

البتہ عام حالات میں (جدید نظریات کی رو سے) جب ہم ذرائع ابلاغ کہتے ہیں تو پھر اس میں نہ صرف دین کی تبلیغ شامل ہے، بلکہ اس میں معلومات ہیں، تفریح ہے، تحریک ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں علم بھی ہے۔ لیکن جب ہم لفظ تبلیغ کی تشریح کرنے بیٹھ جائیں تو پھر اس لفظ کے حوالے سے ایک ہی رخ نمایاں ہوگا یعنی دین اسلام کی ترسیل، چونکہ تمام انبیاء الٰہی خاص کر پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا مقصد انسانوں کو تاریکی سے نور کی طرف ہدایت کرنا تھی، اس لئے اسلام میں "تبلیغ" خدا کے پیغام کو بندوں تک پہنچانے کے عنوان سے اہمیت رکھتی ہے۔

## ذرائع ابلاغ کی تقسیم:

ابلاغ کا مقصد آگاہی، معلومات کی فراہمی اور موجودہ دور میں مختلف اقوام سے رابطہ ہے۔ دوسروں لفظوں میں ابلاغ کے معنی پہنچانے کے ہیں اور یہ پہنچانے کا عمل کسی بھی صورت میں انجام پاسکتا ہے۔ زبانی کلامی صورت میں، عملی و نقلی صورت میں، اشاروں کنایوں کی صورت میں۔ گویا ابلاغ کو تاریخی نقطۂ نظر سے تین جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اول: قولی ابلاغ دوم: فعلی ابلاغ سوم: علامتی ابلاغ

**قولی ابلاغ:** ابلاغ کی یہ قسم بہت موثر اور قدیم ترین ذریعہ کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اس کا رواج اس وقت بھی تھا جب انسان جدید تہذیب و تمدن سے آشنا بھی نہ تھا۔ ماضی بعید اور قریب میں زبانی کلامی ابلاغ زیادہ تر اجتماعات، درباروں اور مذہبی عبادت گاہوں میں وقوع پذیر ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا خطبہ

حجۃ الوداع زبانی کلامی ابلاغ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ آج بھی کئی واقعات کے حوالے سے زبانی کلامی ابلاغ کا عمل زیادہ موثر مانا جاتا ہے۔ جیسے تبلیغی جماعت کے اجتماعات، امام حسینؑ کی مجالس، سیاسی رہنماؤں کے جلسے وغیرہ تاہم ان حقائق کے باوجود زبانی کلامی ابلاغ کیلئے الیکٹرونک آلات ہی بہترین ذرائع متصور واقع ہورہے ہیں۔ جدید انسانی زندگی میں ٹی وی چینلز، ریڈیو اور دیگر الیکٹرونک آلات زبان و بیان کے بہترین ذرائع ہیں۔

**فعلی ابلاغ:** اس کی بھی دو جہتیں ہیں: عملی ابلاغ، نقلی ابلاغ۔ عملی ابلاغ کا عنوان بہت موثر اور تاریخی نوعیت کا رہا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت سے قبل کی زندگی اس سلسلے میں اہم شاہد کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ چالیس سال تک آپ ﷺ کا خاموش کردار اُس زمانے کی مکی زندگی کیلئے بہترین عملی ابلاغ کا نمونہ تھا۔ ''صادق وامین'' کے القابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ آپ ﷺ کے خاموش ابلاغی عمل کو بہت زیادہ قریب سے جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب کے قبائل آپ ﷺ کے اس کرداری عمل سے متاثر ہو کر اپنے اجتماعی فیصلے کرواتے تھے۔ جھوٹ، دھوکہ دہی، فریب، چوری، زنا، ناپسندیدہ افعال سے اجتناب اور بری صحبت سے دوری آپ ﷺ کا وہ تبلیغی کردار تھا جس کے دور رس نتائج ہمیں آج اسلام کی حقانیت کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔ جدید دور میں عملی ابلاغ کی بہترین مثال ایک اچھے انسان کے کردار میں تلاش کی جاسکتی ہے۔

**نقلی ابلاغ:** اس ابلاغ کی وثاقت زیادہ موثر اور قابل بھروسہ ہوتی ہے۔ صحائفِ آسمانی، کتابیں، اور مخطوطات اس ابلاغ کے اہم ترین ذرائع ہیں۔ مسلم اُمہ کے علمی ذخائر اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ احادیث، علوم تفسیر، علم رجال، علم درایت، علم روایت نقلی ابلاغ ہیں۔ جدید دنیا میں اخبارات، رسائل، جرائد، مجلے، ویب سائٹس کو نقلی ابلاغ کہہ سکتے ہیں۔ ویب سائٹس کی ذیلی تشریحات کے ضمن میں فورم، بلاگس، سوشل نیٹ ورکنگ جیسے سماجی ابلاغیات بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔

**علامتی ابلاغ:** تصویروں اور خاکوں کے ذریعے اپنا مافی الضمیر کا اظہار قدیم طرزِ ابلاغ ہے۔ جبکہ اشارے کنایئے بھی ماضی بعید سے علامتی ابلاغ کے طور پر انسانوں میں رائج رہے ہیں۔ خاص طور پر زبان سے معذور افراد اپنا مافی الضمیر کے اظہار کیلئے اس طریقہ تکلّم کا سہارا لیتے ہیں۔ قبل از تاریخ اس طریقہ ابلاغ کا

رواج عام تھا۔ آج بھی ایک ملک کے شہری کسی اجنبی ملک کی زبان سے نابلد ہوتے ہیں تو اسی طریقہ ابلاغ سے اپنا مقصد حل کر لیتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا جب سفر شروع ہوا تو اس وقت انسان کی ضروریات محدود تھی۔ رسل ورسائل کی فروانی نہیں تھی۔ معاشرتی آبادی چند گنے چنے لوگوں اور قبائل پر مشتمل تھی، جو اپنی ضروریات زندگی کے حصول کیلئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اس بات کی وضاحت نہیں ملتی کہ قدیم زمانے کا انسان شعوری طور پر ابلاغ کو منقسم مانتا تھا۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ وہ باہم بات چیت کرتے تھے اور اپنے مطالب کے اظہار کیلئے اشاروں کنایوں سے کام لیتے تھے۔ تمدنی ارتقاء کے ساتھ ہی انسان کی یہ ابتدائی زندگی محدودیت کے دائرے سے نکل گئی اور وسیع سے وسیع تر ہو کر آج ہمارے سامنے پورے آب وتاب کے ساتھ کھڑی ہے۔

اب ہر عمل کو ابلاغیات کا نام دیا گیا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے منقسم دنیا میں ابلاغیات کی نت نئی تقسیمات ایک اور سائنسی کمال ہے۔ کہاں وہ دو ہی جہات پر محیط ابلاغ کا طریقہ عمل اور کہاں یہ ابلاغ کا وسیع و عریض میدان۔ ابلاغ نے جب تحریر و تقریر (بول چال) سے نکل کر جدید ٹیکنالوجی کے دامن میں پناہ لی تو یہ کئی جہتوں میں تقسیم ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی ابلاغ کے دائرہ عمل سے خارج ہی نہیں ہے۔ اجتماع عام ہو یا خاص، باہمی بات چیت ہو یا انفرادی شخصیت کی تربیت، زندگی کے ہر پہلو میں ابلاغ کا عمل بتدریج نمایاں ہوتا جارہا ہے۔

سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی زندگی کا کوئی عمل ابلاغ سے خارج بھی ہے؟ جبکہ عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ابلاغ کا دائرہ کار کس حد تک متعین کیا جاسکتا ہے۔ مذہب (اسلام) کی قید و بند سے آزاد ہو کر سوچا جائے تو ابلاغی عمل میں کوئی حد ہی نہیں۔ ہر چیز، ہر عمل اور ہر فعل ابلاغ ہے۔ گائیکی، فن کاری، مزاحیہ نگاری، شاعری (کسی بھی صنف کی ہو) مصوّری اور دیگر حرکات وسکنات جن کا جدید انسانی زندگی سے روز مرہ کا تعلق ہے، تمام کے تمام ابلاغیات کے زمرے میں آتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں بھی ذکر کیا تھا کہ بامقصد ابلاغ ہی اسلام کی نظر میں قابل قبول ہے وگرنہ ہر عمل یا فعل ابلاغ تو ہوگا، لیکن مقصدیت کے معنی سے خالی ہوگا۔ اسلام نے مقصدِ ابلاغ کا دائرہ

کا رد و پہلو پر منحصر کر دیا ہے، انسانیت کی فلاح اور معاشرے کی اصلاح، ان دونوں مساعی سے ہٹ کر کسی تیسری چیز کا وجود یقیناً نہیں ہے جو مقصدِ اسلام بھی ہو اور مقصدِ ابلاغ بھی۔

## اِبلاغ، آغاز وارتقاء:

زمین پر بنی نوع انسان کا پہلا قدم ایک امتحانی امر تھا۔ کتب سماوی اور دیگر ذرائع کے مطابق یہ امتحان جنت میں پیدا گئے گئے پہلے انسان جس کو زمین کیلئے ہی خلق کیا گیا تھا، سے لیا گیا۔ قرآنی مفاہیم بتاتے ہیں کہ یہ پہلے انسان حضرت آدمؑ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی نیابت کیلئے پیدا کیا تھا۔ ترکِ اولیٰ یا حکمِ عدولی جیسے نظریات پر بحث سے قطع نظر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جس دن زمین پر پہلا انسانی قدم پڑا اُس دن سے ابلاغ کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ انسانی آبادی کے آغاز میں ذرائع ابلاغ کی شروعاتی ہیئت تکونی تھی:

- اللہ تعالیٰ کی ذات: جو ابلاغ کی خالق اور اس پورے عمل کا محور تھی۔
- جبرئیل امینؑ: اللہ اور پہلے انسان کے درمیان ابلاغی فرائض انجام دینے والا مقدس فرشتہ۔
- حضرت آدمؑ: پہلے انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ابتدائی ابلاغ کیلئے موزوں ظرف قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو ہستیوں (جبرئیل امینؑ اور آدمؑ) کو اپنے کلام کیلئے منتخب کیا۔ ایک کی ذمہ داری کلام اللہ کی ترسیل قرار پائی دوسرے نے اس امر (کلام اللہ) کو قبول کرنے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔ خانہ کعبہ کی پہلی تعمیر ہو یا گندم کی بوائی، پتھر اور لوہے کی رگڑ سے آگ پیدا کرنے کے طریقے، تن ڈھانپنے کیلئے لباس اور باقاعدہ زندگی کی شروعات کے تمام امور سمیت دیگر ابلاغی تجربات فرشتوں کے ذریعے انجام پائے۔

زمین پر اُترے جانے کے بعد حضرت آدمؑ اللہ تعالیٰ سے مسلسل حالتِ ابلاغ میں رہے اور یہ تعلق فرامین کی ترسیل اور قبولیت سے بڑھ کر ادیم الارض کی پوری زندگی کو محیط کر گیا۔ مزید برآں باہمی پیغام رسانی کا یہ تعلق اُس وقت اور گہرا ہوتا گیا جب حضرت آدمؑ کو باقاعدہ زمین کی نیابت ملی۔ فرشتوں خاص کر جبرئیل امینؑ کا نزول شبانہ روز ہوا، فرامین و احکامات کی ترسیل میں تیزی آگئی یہاں تک کہ زمین پر موجود پہلے انسان اپنے خالق ازلی سے مضبوط ابلاغی تعلق پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ (19)

انسانی معاشرے کا ایک دوسرے سے باہمی رابطے کا سب سے پرانا اور سب سے موثر ذریعہ میل جول اور گفتگو ہے۔ اگر ہم معاشرے کی ارتقاء کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے بولنے، اشاروں سے اپنا مطلب وضع کرنے کے طریقوں کے بعد تحریر کا طریقہ سیکھا اور تحریر کی ایجاد کے بعد بھی انسان نے براہ راست رابطے کا سلسلہ ترک نہیں کیا بلکہ اس طریقے میں وقت کے ساتھ ساتھ نئے انداز ایجاد ہونے لگے۔ یہ ابلاغی پہلو کا ایک رُخ تھا۔ دوسرے پہلو میں جستجو، تشکیک و تحقیق وہ شروعاتی اسباب ٹھہرے جن کی بنیاد پر علم الاخبار کی ہیئتِ مجموعہ (اخبارات، رسائل، جرائد اور دورِ جدید میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا [سماجی ذرائع ابلاغ] وغیرہ) وضع ہوئی۔ اشاروں کنایوں سے آغاز کرنے والا انسان آہستہ آہستہ متمدن زندگی کی طرف بڑھا۔ خبر رسانی کی بنیاد پڑ گئی، اس کام کیلئے کبوتروں، گھوڑوں، مخبروں وغیرہ کو حسبِ موقع استعمال کیا گیا۔

باقاعدہ ابلاغی ہیئت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ بول چال اور اشارے کنایئے شروع سے ہی انسانی ضروریات رہے ہیں اور بالاصراران دو ذرائع کو ابلاغی عمل کا حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ قدیم زمانے کا انسان شعوری طور پر ابلاغ کو منقسم مانتا تھا، تو یہ مفروضے پر مبنی ایک دعویٰ ہی ہو سکتا ہے۔ بعض ماہرینِ ابلاغیات نے باضابطہ ابتدائی تاریخ متعین کی ہے اور قرار دیا ہے کہ آج سے دس ہزار سال قبل ابلاغِ عامہ کا عمل شروع ہوا۔ اُس دور میں ابلاغِ عامہ کی وضعی ہیئت کچھ یوں تھی:

- اشاروں اور تصاویر کے ذریعے پیغام کی ترسیل
- زبان کی توسط سے اِبلاغ
- لکھائی اور خطاطی کے ذریعے۔ (20)

مشہور مورخ حافظ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) کے مطابق: ''اللہ تعالیٰ نے ارض و سماوات کی تخلیق سے پچاس ہزار قبل جملہ موجودات کی تصاویر بنادی تھیں۔ جبکہ قلم کی تخلیق بھی کائنات سے قبل کی بتائی گئی ہے۔ (21) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ سے قبل زمین پر باضابطہ ایک نظامِ حکومت کا تصور موجود تھا۔ مشہور مورخ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء) کہتے ہیں:

حضرت آدمؑ سے قبل زمین پر جنوں اور نسناس کی حکومت تھی۔ انہی جنوں کی نسل سے ایک شخص ہاموس تھا جو نہایت مقدس اور زیورِ علم و دانش سے آراستہ تھا۔ اس نے پوری قوت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور احکامِ خداوندی کو پوری دیانت کے ساتھ مخلوق تک پہنچایا۔ (22)

بعض ماہرین کے نزدیک زمین پر انسان کا وجود کم و بیش ۱۰ لاکھ سال سے ہے۔ (23) بعض نظریات کے مطابق "کائنات پہلے لگائے گئے اندازے سے بھی زیادہ قدیم ہے۔" (24) حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بعد انسانی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دیگر کئی حوالوں سے ادیم الارض کی حیثیت نمایاں نظر آتی ہے وہی چند ایسی خصوصیات بھی ہیں (ابلاغی تناظر میں) جن کا تعلق صرف حضرت آدمؑ کی ذات سے ہے۔ جیسے:

"دنیا میں جتنی زبانیں آئندہ دور میں بولی جانے والی تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سب میں ماہر قرار دیا تھا۔" (25)

"جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت سے زمین پر اُتارا تو انہیں تمام صنعتوں کا علم بھی عطا فرمایا۔" (26)

"اولین پیغمبر حضرت آدمؑ پر ساٹھ صحیفے نازل ہوئے، بعض نے بیس اور اکیس لکھا ہے۔ جبکہ حروف تہجی بھی نازل کئے گئے تھے اور ان کی تعداد اٹھائیس تھی۔" (27)

ابنِ جریر طبری نے آسمانی کتابوں کی تعداد ایک سو چودہ بیان کی ہیں اور ان میں سے پچاس کتابیں (صحیفے) حضرت آدمؑ پر نازل کی گئیں۔ وہ اپنی معروف کتاب تاریخ طبری میں لکھتے ہیں:

"جملہ آسمانی کتب کی تعداد جن میں توریت، زبور، انجیل اور قرآن شامل ہیں، ایک سو چودہ تھی، جن میں سے ۵۰ حضرت آدمؑ پر ۳۰ حضرت شیثؑ اور حضرت نوحؑ پر ۲۰، حضرت ابراہیمؑ پر اور ۱۰ دیگر پیغمبروں پر نازل کی گئیں۔" (28)

ایک جگہ طبری نے حضرت آدمؑ پر نازل ہونے والے صحیفوں کی تعداد اکیس لکھی ہے اور یہ تمام صحیفے آدمؑ نے اپنے رسم الخط میں تحریر کئے تھے۔ (29)

یہ تاریخ کا وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ درجہ بالا تمام خصوصیات انسان کے تعلیم و تعلّم سے تعلق رکھتی ہیں اور قریب قریب یہ تمام خصوصیات (علم الحروف، صحیفے، تمام زبانوں کا علم) ابلاغی

عمل کا آغاز بھی ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آدمؑ کی خلقت سے قبل بھی زمین پر آبادی تھی اور ان میں بھی ابلاغیات کا عنصر موجود تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے چار ہزار سال پہلے انسان نے تمدن کی بنیاد رکھی۔ الفبا، خط، تجارت اور دیگر تمدن کے اہم عناصر اسی دور میں معرضِ وجود میں آئے۔ پتھروں سے معماری کا کام شروع ہوا، وسائل زندگی کے آلات ایجاد کئے گئے۔ مشہور مستشرق کیرن آرم اسٹرانگ لکھتی ہیں:

*''A similar spirituality had characterised the ancient world of Mesopotamia. The Tigris-Euphrates valley, in what is now Iraq, had been inhabited as early as 4000 BCE by the people known as the Sumerians who had established one of the first great cultures of the Oikumene (the civilised world). In their cities of Ur, Erech and Kish, the Sumerians devised their cuneiform script, built the extraordinary temple-towers called ziggurats and evolved an impressive law, literature and mythology'' (30)*

حضرت عیسیٰؑ سے چار ہزار سال قبل میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) میں لوگ آباد تھے جنہیں سومیریوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انہوں نے مہذب دنیا کا اولین کلچر قائم کیا تھا۔ سومیریوں نے اپنے شہروں اُر، اَریک اور کِش میں خط میخی ایجاد کیا، میناروں میں معبد بنائے اور ایک متاثر کن شریعت تشکیل دی۔ انہوں نے بے مثال ادب اور اساطیر بھی تخلیق کی۔

ایک اور معروف مورخ نے دعویٰ کیا ہے کہ دس ہزار سال قبلِ مسیح انسان دورِ حجری میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس انسان کی دو بڑی سرگرمیاں تھیں۔ وہ کھیتی باڑی کرنا سیکھ گیا تھا اور گھروں میں جانور پالنا بھی ان کے روز مرہ کے اُمور میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے آباؤاجداد کے بنائے ہوئے اوزاروں کی بجائے صیقل کئے ہوئے اوزار استعمال کئے۔ تنکوں سے ٹوکریاں بناتے جبکہ ظروف سازی بھی اُن کی صنعت بن گئی تھی۔ (31) معروف ایرانی عالمِ دین سید مجتبیٰ موسوی (متوفی ۱۴۳۴ھ) لاری کہتے ہیں:

''اسی دور میں (حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے چار ہزار سال قبل) ایک بڑا دین ظاہر ہوا۔ ابراہیمؑ نے سرزمین بابل پر خدائے یگانہ کی توحید کا پرچم بلند کیا اور خداوند عالم نے سرزمین بابل کے سرگشتہ معاشرے کی رہبری کا تاج حضرت ابراہیمؑ کے سر پر رکھا۔ آپؑ نے محنتِ شاقّہ برداشت کرکے ان کے غیر منطقی عقائد وافکار سے جنگ شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سربراہانِ افکارِ

باطل حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں صف بستہ ہوگئے۔ سب سے بڑا خطرہ ابراہیمی تبلیغ کو نمرود کی ذات سے تھا۔" (32)

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان کا زمانہ، بقول مورخین تمدن سے خالی نظر آتا ہے، اگرچہ اس سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ابراہیمؑ سے قبل کا زمانہ تاریک اور تمدن سے نابلد تھا۔ البتہ تاریخ کے لب خاموش ہیں اس لئے فرض کیا جاسکتا ہے کہ تمدنی دور کا باضابطہ آغاز بہت بعد میں ہوا۔ مورخین کا یہ نظریہ بھی قابل غور ہے کہ حضرت آدمؑ سے قبل کی تاریخ بھی آبادی سے خالی نہیں رہی ہے اور اس دور میں بھی ریاست، بادشاہان اور رعایا کی صورت میں ایک مکمل نظامِ زندگی کا وجود تھا۔ لہٰذا اگر جینے کا بہترین انداز ہی تمدن ہے تو پھر قبل از آدمؑ، مخلوقات کی زندگی کو تعبیر کرنے کا کوئی طریقہ وضع کرنا ہوگا۔

رعایا سے بھرپور ان کی باضابطہ ریاست کو جو ایک سربراہ کے ماتحت ہوتی تھی، کو بالکل ہی تمدن سے مبرا قرار دینا شاید حقیقت پانے کی درست کاوش نہ ہوگی۔ یہ بات بھی نمایاں طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ ارض و سماء کی خلقت کا براہ راست تعلق مخلوقات سے ہے۔ جب آدمؑ سے قبل مخلوقات تھیں اور وہ باقاعدہ ایک نظام کے تحت زندگی گزار رہی تھی تو پھر لامحالہ وہ زندگی کے طور طریقے بھی جانتے تھے۔ وہ باہمی کلام بھی کرتے تھے اور ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے بنیادی اصلاحی طرائق بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ لہٰذا جیسے ہی دنیا میں خلقت کا آغاز ہوا ویسے ہی بول چال، رہن سہن، طور طریقے اور سب سے بڑھ کر سلیقے معرضِ وجود میں آئے اور ابلاغ کو بھی ان شروعاتی مبادیات میں سے ایک بنیادی عنصر فرض کرنا ہوگا۔

چار ہزار سال قبل مسیح کی تاریخ کو تہذیب و تمدن سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ انسان کی دنیا شناسائی سے تعلق رکھتی ہے۔ وگرنہ آبادی اور انسان کی موجودگی مندرجہ بالا تاریخ سے قبل بھی تھی۔ اس بناء پر ہم یہ کہیں گے کہ باقاعدہ تمدنی و تہذیبی دنیا کے آغاز کے بعد ایک طرف انسان نے خود کو شناخت کی منزل پر لے آیا تو دوسری طرف زمین کے طول و عرض اور عجائبات سے بھی رشتہ استوار کیا۔ یہاں چونکہ ہمارا مقصد ابلاغی

عمل کو بیان کرنا ہے اس لئے ہم یہ بحث نہیں کریں گے کہ انسان کے تہذیبی شب و روز آہستہ آہستہ کیسے ترقی کی طرف بڑھے یا جدید زندگی کا فاصلہ کس قدر سرعت کے ساتھ سمیٹ گیا۔

انسان نے سیکھا، جانا اور آئندہ نسل کی طرف اپنے تجرباتی نقوش منتقل کئے۔ لامحالہ اس بات کے مشاہدے اور قرینے بڑے واضح ملتے ہیں کہ جب سے انسان کا وجود مستقر ہوا تب سے اُس نے اپنے وجود کی بقاء کیلئے سخت محنت کی۔ گروہی، اجتماعی، دفاعی، معاشی اور گھریلو زندگی، یہ وہ مدراج ہیں جو انسانی بقاء کیلئے کی جانے والی جدوجہد کے نتیجے میں تشکیل پائے۔ خوف و دہشت ہوئی تو پتھر کو صیقل کرکے ہتھیار کی شکل دی۔ اُنسیت کی ضرورت محسوس کی تو گھریلو زندگی ترتیب دی، بھوک اور پیاس کا احساس ہوا تو مختلف اَوزار تخلیق کئے، تنہائی نے کاٹ کھایا تو گروہی و اجتماعی زندگی کی طرف راغب ہوا۔ ایک ایسے دور میں جب مختلف اشیاء پہلی دفعہ معرضِ وجود میں آئی، یہ سوچنے کی بات ہے کہ انسان علم کی باریکیوں سے ناآشنا ہونے کے باوجود کن صلاحیتوں کی بناء پر ان آلات کا موجد ٹھہرا؟ اپنے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا یہ ابتدائی فن یا سائنس تین وجوہ سے خالی نہیں:

**اول:** یا تو انسان عالم تھا کہ اس نے اپنے علم کے بل پوتے پر یہ آلات ایجاد کئے۔

**ثانی:** یا انسان میں اتنی صلاحیت تھی کہ بغیر کسی سے سیکھے، اپنی ذات میں موجد تھا۔

**ثالث:** یا یہ تمام اشیاء انسانی ضرورت کے تحت معرضِ وجود میں آئیں۔

اول الذکر دونوں وجوہات کو یقینی طور پر اس لئے قبول نہیں کر سکتے کہ بقول مورخین ابتدائی انسان تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھا۔ جبکہ آخر الذکر وجوہ کی اہمیت کو رد کرنا اس لئے درست نہیں کہ اس کی قبولیت کے بغیر تین وجوہ پر مبنی مفروضے کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ مفروضہ ثابت نہ ہوا تو گویا تاریخ کو بھی ہر پہلو سے رد کرنا ہوگا جبکہ ہماری پوری بات چیت کا انحصار قلم اور تاریخ پر ہے۔ لہٰذا آخری نقطہ نظر کو درست قرار دے کر ہم یہ دعویٰ کریں گے کہ انسان کا وجود چاہے تہذیب سے قبل کا ہو یا بعد کا، ہر دو صورت ضرورتوں میں گھرا رہا ہے۔ ابلاغ یعنی بات چیت، اشارے کنایئے، خاکے، نقشے اور تصویریں، یہ تمام انسان نے ضرورت کے تحت اپنائی ہیں۔ خاص طور پر بات چیت کا ابتدائی مرحلہ اس بات کی نشاندہی

ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے جیسے ہی انسان سے متعارف کرانا چاہتا ہے۔ ذہنی ہم آہنگی نے مزید شہ دی اور مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں انسانی رہن سہن میں بڑا انقلاب آیا۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابلاغ کی طرف راغب ابتدائی ملک، شہر یا فرد کون ہو سکتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی تمام آبادی بیک وقت ابلاغ کی طرف متوجہ رہی ہو۔ یہ تو ماننا ہوگا کہ ابلاغ کی دریافت انفرادی کوششوں سے ہوئی ہے اس پر اجتماعیت کا حکم لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ یونان، چین، جاپان اور مصر، یہ وہ قومیں تھیں جنہوں نے ابلاغی دریافت میں سبقت کی۔ تصویروں اور علامتوں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اپنی تہذیب کو مختلف ذریعوں سے برابر ترسیل کرتے رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابلاغ بھی ان ذرائع میں سے ایک بہترین ذریعہ تھا جو مذکورہ بالا قوموں کی تہذیبوں کو آئندہ نسل تک منتقل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ بنا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

انسانی شعور کے فروغ وارتقاء کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بارے میں معلومات جمع کرنے اور ان کے تجربات سے استفادہ کرنے کی خواہش بڑھتی چلی گئی، بالآخر اسی جذبے اور خواہش نے خبروں کی ترسیل کو مختلف مراحل سے گزار کر ذرائع ابلاغ کی شکل میں پیش کرنے کی ترغیب دی اور بعد میں آنے والے انسانوں نے اپنے سے ماقبل لوگوں کے حالات سے باخبر رہنے کیلئے انہی ذرائع کو استعمال کیا۔ صرف یہی نہیں کہ ان ذرائع ابلاغ سے زمانہ ماضی اور حال کے حالات معلوم کئے گئے بلکہ جہانِ عالم کے دیگر عجائبات سے واقفیت بھی انہی ذرائع سے حاصل کرنے کی رِیت پڑ گئی۔

## ذرائع ابلاغ کی اہمیت

ذرائع ابلاغ کو اہمیت کیوں دیں؟ کیا زندگی کی دوسری اشیاء کوئی معنی نہیں رکھتیں؟ بالفرضِ محال اگر انسان اپنے اِرد گرد بلکہ دنیا جہاں کے حالات سے باخبر نہ ہو تو کیا قباحت ہے؟ ان تمام سوالات کے تناظر میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ تشکیک و تحقیق انسانی فطرت کے اصول ہیں۔ نامعلوم کو معلوم، پوشیدہ کو ظاہر اور شک کو یقین میں بدلنے کی قوت انہی دو اصولوں کی بنیاد پر انسان کو حاصل رہی ہے۔ لہٰذا حالاتِ حاضرہ و معلوماتِ عامہ کی طرف ملتفت ہونا انسان کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زمین پر انسانی موجودگی کے ساتھ ہی معلومات کو جذب کرنے

اور بعدازاں ان معلومات کو آئندہ نسلوں تک باقاعدہ منتقل کرنے کی وجہ ابلاغ کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔

آئندہ ادوار میں اس عمل کو زمانے کی اہم ترین ضرورت سمجھ کر نسل در نسل تفویض کر دیا گیا۔ جدید عالمگیریت کے تناظر میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اب ذرائع ابلاغ کا مفہوم بلاغت سے بڑھ کر علمیت اور تحقیق کی سطح تک پہنچ گیا ہے۔ دنیا جہاں میں ہونے والی علمی و سائنسی تحقیقات سے آگاہی ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی سہولیات کی موجودگی میں اس بات کو مد نظر رکھ کر کہ ذرائع ابلاغ معاشرے کے بگاڑ کا سبب رہے ہیں، ذرائع ابلاغ سے منہ موڑا جائے؟ اسلام شروع سے ہی غور و فکر اور تعلیم و تعلّم کا سب سے بڑا حامی رہا ہے اور اسی نظریہ کے تحت حکمت مومن کی گمشدہ میراث قرار پائی۔ لہٰذا آج کے دور میں گمشدہ میراث کے حصول کیلئے ذرائع ابلاغ سے زیادہ بہتر راستہ کہاں مل سکتا ہے۔

عظیم فلسفی صدرالدین شیرازی عرف ملاصدرا (متوفی ۱۲۳۹ھ) جاننے اور مزید جستجو کو اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ اسرار میں سے قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق اپنے حال میں مگن اور خود ساختہ علم کے حامل انسان کی کوئی اوقات نہیں۔ ملا صدرا لکھتے ہیں:

> ”یاد رکھنا چاہیے کہ جو آدمی اپنی معلومات کی چار دیواری میں مقید ہے اور جو کچھ سمجھے ہوئے ہے اس کے سوا ہر بات کا انکار کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بیچارہ اپنے علم کی سرحد پر کھڑا ہوا ہے اور اپنے رب کے پوشیدہ اسرار سے محجوب اور پردے میں ہے۔“ (33)

معروف مورخ المسعودی (متوفی ۳۴۵ھ) نے تو ہر خاص و عام کو علم الاخبار کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

> ”دنیا کے عجائب و غرائب کا پتہ بھی علم الاخبار سے چلتا ہے جو عالم و جاہل دونوں کیلئے یکساں ہے، احمق ہوں یا عاقل دونوں اخبارِ عالم سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور عوام ہوں یا خواص، عربی ہوں یا عجمی سب کو ہر معاملے میں علم الاخبار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔“ (34)

رہبر انقلابِ ایران آیت اللہ روح اللہ الموسوی الخمینی (متوفی ۱۹۸۹ء) کہتے ہیں:

''نشریات (ذرائع ابلاغ) کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی محاذ جنگ پر قربان ہونے والی جانوں کی ہے۔''(35)

عصر حاضر میں ابلاغیات کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو معروف پاکستانی عالم دین مفتی محمد شفیع یوں بیان کرتے ہیں:

- خبر گیری سنت ہے
- مسلمانوں کی قومی شکایات و مظالم کو بآسانی پہنچایا جاسکتا ہے
- اپنے حقوق کا مطالبہ بسہولت کیا جاسکتا ہے
- تبلیغی ضرورتیں بخوبی ادا کی جاسکتی ہیں(36)

ان توجہات کے تناظر میں چند باتیں ابلاغ کی ضرورت کو بہت نمایاں کرتی ہیں۔ باہمی ابلاغ سے مسلمان ایک دوسرے کے حالات و واقعات سے واقف ہوتے ہیں، ابلاغ شکایات اور مظالم کے ازالہ کا آسان راستہ ہے، حقوق منوانے کی سہل پسند راہ ہے اور اس میں تبلیغی ضروریات پورا کرنے کی خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ جبکہ اس مسابقتی دور میں ایک خود مختار ملک خاص طور پر اسلامی ریاست، جہاں وہ دفاعی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے خود کو مستحکم کرے وہی ذرائع ابلاغ سے بھی مضبوط رشتہ استوار کرے۔

ذرائع ابلاغ کا ہی کمال ہے کہ آج دنیا کے مختلف معاشروں اور ادوار میں سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور تمدنی انقلاب رونما ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی اہمیت و ضرورت ہر دور میں مسلم رہی ہے اور فی زمانہ اِن کے مناہج اور طریقے بھی نئے روپ اور نئی تبدیلیاں اپناتے رہے ہیں۔ لیکن اس پیشہ کو اس وقت تک ہی عوام میں وقار و سرخروئی حاصل رہی ہے جب تک اس کا اصل مطمع نظر رفاہِ عامہ رہا ہے۔ مفتی شفیع مزید لکھتے ہیں:

''اخبارات وجرائد کا وجود اپنے رنگ و روپ میں اور اپنے دنیاوی اصول کے مطابق ہو تو بہت سے عظیم الشان فوائد کا مجموعہ بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کا رکنِ اعظم ہے۔''(37)

مشاہدے کی بات ہے کہ جو انسان، قوم یا ملک ترقی کی راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، اس کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ کو اہمیت دے۔ اس کے بغیر جدید دور میں ترقی کا تصور اور اپنی بالادستی کا خیال ایک وہم کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ مشہور اسکالر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۱۹۷۹ھ) کہتے ہیں:

''جو لوگ ریڈیو کے زور سے ایک سیکنڈ کے اندر باطل کی آواز کرۂ زمین کے ایک ایک کونے میں پہنچادیں اور کروڑہا انسانوں کے خیالات کو ایک جنبشِ زبان سے مسموم کرکے رکھ دیں ان کے مقابلہ میں وہ لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک جلسہ کے سامعین تک بھی حق کی آواز پہنچانے میں خدا کی پیدا کی ہوئی ایک طاقت سے کام لیتے ہوئے جھجکتے ہوں۔'' (38)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے اپنے دین (ہدایت) کو انسانوں تک پہنچایا۔ جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے زمانے اور حالات کے میسر ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچایا اور درمیان میں موجود پیغام (ہدایت) اس تکونی ہیئت کا مرکزی نکتہ قرار پایا۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ جدید دور میں ذرائع ابلاغ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے ادا کرکے رائے عامہ کی بیداری کا باعث بن سکتے ہیں۔ آج کے دور میں صرف وہی اقوام اور نظریات عالمی منظر نامے پر حاوی نظر آتے ہیں جو ذرائع ابلاغ کے میدان میں بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

حقیقت میں جدید دور ذرائع ابلاغ کے جنگ کا دور ہے۔ آج میڈیا فقط خبریں پہنچانے کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ اپنی سیاست، ثقافت یہاں تک کہ مذہب و عقائد کو دوسرے پر مسلط کرنے کے ذریعے میں بدل چکا ہے۔ موجودہ دور میں سامراج کے تسلط کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ بھی یہی ذرائع ابلاغ ہیں۔ آج مغربی طرزِ تکلم میں مضبوط دلیل اور حاوی رہنے کی جھلک نمایاں نظر آرہی ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف ذرائع ابلاغ پر بھرپور تسلط ہے۔

انہوں نے ماضی میں بھی ذرائع ابلاغ سے بھرپور استفادہ کیا اور موجودہ دور میں بھی اس کو بطور ہتھیار استعمال کررہے ہیں۔ اندورنی طور پر خامیاں ہی سہی لیکن بیرونِ دنیا خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے طریقہ کار میں یکسوئی نظر آتی ہے۔ اُن کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نام و نہاد جدوجہد کے پس منظر میں ان کی اِکائی کام کررہی ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ ان کے پیش نگاہ کسی واقعہ کی

صداقت (اگرچہ وہ واقعہ خارج میں وجود بھی نہ رکھتا ہو) کیلئے ضروری ہے کہ اُس کو مسلسل اچھالا جائے یہاں تک کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ ہولوکاسٹ (اجتماعی بہیمانہ قتل) واقعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

*****

# حوالہ جات

1۔ فعل ثلاثی مجرد: یہ عربی گرائمر کی مبادیات میں سے ہے اور اس کا مطلب ہے کہ جس کے ماضی کے صیغہ واحد مذکر غائب میں حروف اصلی کے علاوہ کوئی اور لفظ زائد نہ ہو، جیسے نصر، ضرب وغیرہ۔ اس کے مادّے میں تین حروف ہوتے ہیں۔ چھ مختلف اوزان سے فعل ماضی بنتا ہے اور یہ اوزان فعل ثلاثی مجرد کے ابواب کہلاتے ہیں۔ان ابواب کے نام سب سے زیادہ عام استعمال کے فعل کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ یہ ابواب مندرجہ ذیل ہیں: (۱)حَسِبَ یحْسِبُ (۲)سَمِعَ یَسْمَعُ (۳)فَتَحَ یَفْتَحُ (۴)نَصَرَ یَنْصُرُ (۵) کَرُمَ یَکْرُمُ (۶)ضَرَبَ یَضْرِبُ

2۔ باب افعال: باب افعال کے معنی جانکاری فراہم کرنا اور علم دینا ہے۔اس باب میں کسی کام کو ایک مرتبہ کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ ثلاثی مزید فیہ کے ابواب میں سے ایک ہے۔ زیادہ تر تعدیہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ تعدیہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے لازم کو متعدی بنایا جاتا ہے اور فاعل کو مفعول بنایا جاتا ہے۔ جیسے فعل لازم "جَلَسَ" کو متعدی بنائیں گے تو "اَجْلَسَ" ہو جائے گا۔

3۔ثلاثی مزید فیہ: فعل ثلاثی مزید فیہ سے مراد تین حرفی مادہ کا ایسا فعل ہے جس کے اصلی تین حروف کے ساتھ کسی حرف یا کچھ حروف کا اضافہ کیا گیا ہو۔ یہ اضافہ فعل ماضی کے پہلے صیغے سے معلوم ہوسکتا ہے۔اس کے آٹھ ابواب ہیں: (۱) باب افعال (۲) باب تفعیل (۳) باب مفاعلہ (۴) باب تفعّل (۵) باب تفاعل (۶) باب افتعال (۷) باب انفعال (۸) باب استفعال

4۔ باب تفعیل: باب تفعیل بھی معلومات کی فراہمی اور علم کی ترسیل کے معنی میں آتا ہے۔اس باب میں عموماً کسی کام کو درجہ بدرجہ اور تسلسل سے کرنے یا کثرت سے کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے ایک شخص نے آپ سے کسی جگہ کا پتہ پوچھا اور آپ نے اسے بتایا تو یہ " اعلام" ہے لیکن کسی چیز کے متعلق معلومات جب درجہ بدرجہ اور تسلسل سے دی جائے تو یہ "تعلیم" ہے۔

5۔اصفہانی، ابی القاسم حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دار المعرفۃ، بیروت، س ن، ص: ۶۰

6۔ نعمانی، مولانا عبدالرشید، لُغات القرآن، عمر فاروق اکیڈمی، لاہور، س ن، ص: ۱۰-۱۱
7۔ ابن منظور، لسان العرب، دار المعارف، قاہرہ، س ن، ص: ۳۴۵-۳۴۶
8۔ اصفہانی، ابی القاسم حسین بن محمد، محولہ بالا، ص: ۶۱
9۔ لوئیس معلوف، المنجد عربی..... اُردو، (مترجم: مولانا عبدالحفیظ بلیاوی)، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۷۳
10۔ سورۃ الانبیاء، آیت: ۱۰۶
11۔ الہاشمی، سید احمد، جواہر البلاغہ، ج۱، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۴۲۹ھ، بمطابق ۲۰۰۸ء، ص: ۲۸
12۔ قرائتی، محسن، قرآن و تبلیغ، سازمان چاپ وانتشارات وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، تہران، ص. پ، ۱۳۱۱، ص: ۲۷ تا ۲۹
13۔ اصفہانی، ابی القاسم حسین بن محمد، محولہ بالا، ص: ۶۰-۶۱
14۔ طوسی، ابی جعفر محمد بن الحسن، التبیان فی تفسیر القرآن، ج ۴، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، س ن، ص: ۳۷
15۔ طاہر القادری، ڈاکٹر، قرآنی فلسفہ تبلیغ، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت چہارم: ستمبر ۲۰۰۷ء، ص: ۱۱
16۔ خلیلی، منیر احمد، ''اسلامی صحافت کے لازمی تقاضے'' مشمولہ: ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور، ہندوستان، ۲۰۱۱ء، ص: ۳۱
17۔ ولبر شریم، ''ابلاغ کس طرح ہوتا ہے؟''، مشمولہ: ابلاغیات، ادارہ ابلاغیات، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص: ۳۲۹
18۔ ولبر شریم، محولہ بالا، ص: ۳۲۹
19۔ الطبری، ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، ج۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص: ۸۹ تا ۹۰
20۔ امین لغاری، سعید میمن، جدید صحافت، سندھی کا اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۳
21۔ ابن کثیر، ابوالفد عماد الدین، البدایۃ والنھایۃ، ج۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۴۷
22۔ کراروی، نجم الحسن، تاریخ اسلام، امامیہ کتب خانہ، لاہور، س ن، ص: ۵۱
23۔ ولیم ایل لینگر، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عام، ج۱، (مترجم: مولانا غلام رسول مہر)، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۶
24۔ مشمولہ: روزنامہ جنگ (کراچی)، رپورٹ، ۲۳ مارچ ۲۰۱۳ء، ص: ۱۷
25۔ ابن طاووس، سید رضی الدین علی بن موسیٰ بن جعفر، سعد السعود للنفوس، مکتب الاعلام الاسلامی بوستان کتاب قم، ۱۴۲۲ق، ص: ۱۰۰
26۔ ابن کثیر، ابوالفد عماد الدین، محولہ بالا، ص: ۱۳۳

27۔ کراروی، نجم الحسن، محولہ بالا، ص:۱۱۱

28۔الطبری، ابی جعفر محمد بن جریر، ، محولہ بالا، ص:۳۸۸

29۔ایضاً، ج۱، ص:۱۰۴

30۔ کیرن آرم اسٹرانگ، خدا کی تاریخ، (مترجم: یاسر جواد)، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۱۲

31-H.G Wells, A Short history of the World, (Cosimo Classics, New York, 2007) pg:57

32۔لاری، سید مجتبیٰ موسوی، اسلام و سیمای تمدن غرب، جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، دفتر انتشارت اسلامی، ایران، ۱۳۶۰ش، ص:۱۱

33۔شیرازی، صدرالدین، "اسفارِاربعہ"، حصہ اول (جلداول)، (مترجم: مولوی سید مناظر احسن گیلانی)، جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء، ص:۱۸

34۔المسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، مروج الذہب و معادن الجوہر، ج۱، المکتبۃ العصریۃ، بیروت ۱۴۲۵ھ، بمطابق ۲۰۰۵ء، ص:۴۱

35۔ خمینی، سید روح اللہ موسوی، منتخب کلمات، موسسہ تنظیم و نشرآثارِ امام خمینی، س ن، ص:۱۹۹

36۔عثمانی، مفتی محمد شفیع، صحافت اور اس کی شرعی حدود، ادارہ اسلامیات کراچی لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۲۹

37۔ایضاً، ص:۲۹

38۔ مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ، دعوتِ اسلامی اور اُس کے مطالبات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۴۵۴

# قرآن وسنت میں اتحاد و وحدت کی اہمیّت

غلام محمد*
ghulammuhammadphd@gmail.com

**کلیدی کلمات:** وحدت ،اسلامی حکمت عملی ،میڈیا کی ذمہ داری ،تاریخ اسلام ،سیرت ، باہمی تعاون

## خلاصہ

اسلام دین وحدت ہے ،اسلام کا بنیادی ماخذ قرآن وحدت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔اس کے مطابق اتحادایک حکمت عملی کے علاوہ شرعی ضرورت بھی ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ متحد ہونے کی صورت میں دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کامقابلہ نہ کر سکی۔ امت مسلمہ میں انتشار اورفرقہ واریت اللہ اور اس کے رسولؐ کو سخت ناپسندیدہ ہے۔وحدت سے مراد یہ نہیں ہے کہ اسلامی مذاہب میں سے ایک کاانتخاب کر لیا، بلکہ مختلف مذاہب کے اختلاف کے ساتھ تمام مسلمان دشمن کے مقابلے میں متحد ہونے چاہیں۔اس مقالہ کے آخر میں چند مفید تجاویز بھی دی گئی ہیں، جن کے مطابق شیعہ، سنی مذاہب کی مشترکہ روایات کو شائع کیا جائے۔ تقریب مسالک پر مختلف زبانوں میں کام کیا جائے اور تفرقہ انگیز مسائل کی اشاعت سے گریز کیا جانا چاہیے۔اسلامی ممالک میں مسلکی بنیادوں پر موجود اختلافات کی بنیاد پر کسی کو کافر، مشرک یا واجب القتل قرار دینے کی روایت ختم ہونی چاہیے۔ قتل و غارت پر قابو پانے کے لئے کسی قسم کی رعایت نہ برتی جائے۔ قتل کی حرمت پر مبنی قرآنی آیات سے قوم کو آگاہ کیا جائے۔الیکٹرونک وپرنٹ میڈیا کو معاشرے میں اتحاد کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہیے اور جن امور سے معاشرے میں تفریق جنم لینے کا یقین یا اندیشہ ہو اس کو میڈیا پر لانے سے گریز کیا جائے۔

*۔ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی ،جامعہ کراچی

اسلام کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن وسنت میں مسلمانوں کے وحدت پر بہت زور دیا گیا ہے۔قرآن وسنت کی نگاہ میں اتحادووحدت کے بغیر معاشرتی ترقی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ انسانی تکامل اور ترقی کا دارومدار اسی پر ہے۔ اسلام معاشرتی اوراجتماعی مسائل کو بہت ترجیح دیتا ہے اور مسلمانوں کو گوشہ نشینی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کا نظام اجتماع مسلمانوں کو ایک دوسرے کو مربوط رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا، دکھ درد بانٹنا یہی نظام اجتماعی کابنیادی فلسفہ ہے۔

قرآن وسنت معاشرے میں انسانی اسلامی فضاء قائم کرنے کی غرض سے ایک اور اصل و قانون کا نہ صرف اعلان کرتا ہے بلکہ عملی طور پر اس کا نفاذ بھی چاہتا ہے وہ اصل قانون تعاون ہے وہ بھی تقویٰ اور نیکی کی بنیاد پر۔ یہ قانون معاشرے میں عدل وانصاف اور باہمی تعاون کو تقویٰ اور نیکی کی بنیاد پر پورے معاشرے میں فروغ دینا چاہتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ رُشد وکمال کی طرف گامزن ہوگا۔

معاشرے میں اتحاد بین المسلمین قائم کرنے سے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام خاص طور پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کردار بے مثال ہے بالخصوص مدنی زندگی میں ہر طرف اتحاد اور بھائی چارہ کی فضاء نظر آنے لگی تھی جس کے نتیجے میں مختلف جنگوں میں فتوحات حاصل ہوئیں اور مسلمانوں نے دوسرے علاقوں تک بھی رسائی حاصل کرلی۔

قرآن وسنت کے مطابق تفریق واختلافِ اُمت مسلمہ کی شکست اور اس کے زوال کا سبب ہے۔ وحدت واجتماعیت دین اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسی وحدت واجتماعیت کو ثابت کرنے کے لئے عبادات میں بھی اجتماعیت کو شرعی حیثیت دی گئی ہے۔خدا وند کریم نے امت مسلمہ کو احکاماتِ دینی میں جماعت کے ساتھ مخاطب کیا ہے۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ سب ایک امت ہے، جو ایک جسم کی طرح ہے۔

اسلام اتحاد و وحدت کے تنہا عامل حبل اللہ سے تمسک کی دعوت اور ہر طرح کے اختلاف سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔وہ مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی شمار کرتے ہوئے ان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ان کے آپس کے روابط وتعلقات دوستانہ اور بھائیوں کی مانند ہونے چاہئیں اور پھر چھوٹے چھوٹے اختلافات کی صورت میں بھی صلح کا دستور صادر فرمایا ہے۔ اسلام نے اختلاف کو جاہلیت سے نسبت دیا ہے۔ جیساکہ

جنگ بنی مُصْطَلِق میں مسلمانوں کی فتح کے بعد ایک مہاجر اور انصار کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔ انصاری نے اپنے قبیلے کو اور مہاجر نے اپنے قبیلے کو مدد کیلئے پکارا۔

جب پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسی باتیں (جن سے آپس میں فساد اور خانہ جنگی ہو) چھوڑو یہ ناپاک باتیں ہیں کیونکہ مدد طلب کرنے کی یہ صدا بہت نفرت انگیز اور بدبودار ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت کی دعوتوں جیسی ہے ان دو افراد اپنے دلوں سے ابھی تک جاہلیت کے مذموم اثرات نہیں مٹاسکے ہیں یہ دونوں اسلام کے عظیم مکتب سے بے خبر ہیں، جس نے مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دی ہے اور اسلام کی نظر میں تفرقہ وانتشار کی ہر صدا بے وقعت ہے۔ (1) بہر حال آپ ﷺ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس ابھرتے ہوئے فتنہ کو دبادیا اور تفرقہ واختلاف سے اس امت کو بچالیا۔

اسلام کی نگاہ میں اتحاد کی اہمیت اور ضرورت کو مختلف جہات سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ اسلام جو دین فطرت ہے اور اس کی تعلیمات واحکامات اللہ تعالیٰ کی حکمت وتدبیر کے عکاس ہیں۔ قرآن کریم جسے آفاقی و جاودانی کتاب کا درجہ حاصل ہے، اس میں اس موضوع کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اتحاد کی طاقت اور تفرقہ کے نقصانات بیان کئے گئے ہیں۔ خصوصاً اسلام کے پیروکاروں کو اتحاد کی تاکید کی گئی ہے اور تفرقہ سے بچنے کا کہا گیا ہے۔

ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرے میں پائے جانے والے مختلف مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ معاشرتی تقسیم اور تفرقہ بازی تھا۔ تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس دور میں مختلف قبائل کے درمیان معمولی معاملات پہ سالہا سال جنگ وجدال کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، جس کو اسلام نے باہمی اتحاد اور انسانیت کی تعظیم و تکریم کے تحت حل کر دیا اور جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا تو جن کاموں کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دوسرے کاموں پر ترجیح دی ان میں انفرادی اور اجتماعی وحدت کا قیام قابل ذکر ہیں۔

سرورِ کونین ﷺ اتحاد وہمدلی کے پیغمبر تھے۔ آپ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد اوس وخزرج قبائل کی ایک سو بیس سالہ لڑائی کو صلح اور بھائی چارہ میں بدل دیا تاکہ مسلمان اتحاد کے ساتھ متحد و منسجم رہیں۔ آپ ﷺ نے اس سلسلے میں انفرادی طور پر مسلمانوں میں اخوت اور بھائی چارہ کو فروغ دینے کے ساتھ مدینہ میں

رہنے والے یہودیوں کے ساتھ بھی امن اور وحدت کی فضاء قائم کرنے کے لئے کئی معاہدے عمل میں لائے جن سے بخوبی معلوم ہوتا کہ اسلام کی نگاہ میں اتحاد دوسرے بہت سارے کاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔

چونکہ دوسرے ادیان کے مقابلے میں اسلام دینِ اعتدال ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسلام کا مفہوم ہی سلامتی اور تسلیم ورضا ہے۔امن واتحاد مہذب انسانی معاشرے کی اعلیٰ خصوصیت ہے جہاں وحدت واعتدال نہیں وہاں ظلم وتشدّد ہے۔اسلام کے آنے سے پہلے لوگ باہمی اختلاف وانتشار کا شکار تھے۔اسلام کی نعمت سے ایک دوسرے کے دلوں میں الفت پیدا ہو گئی۔اسلام معاشرے میں اتحاد چاہتا ہے۔

''اتحاد'' افکار وآراء کے ایک ہونے کا نام ہے اور پھر ایک ہدف کی طرف حرکت کرنے کا نام ہے جبکہ اتحاد سے ملتا جلتا لفظ ''اجتماع'' جسموں کے ایک جگہ پر اکھٹے ہونے کا نام ہے۔ ایک عوامی اجتماع میں اجسام کا اجتماع ہوتا ہے، لیکن افکار کے لحاظ سے یہ لوگ شاید ایک دوسرے سے دور ہوں اسی لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جانوروں کے درمیان بھی اجتماع ہوتا ہے لیکن اتحاد نہیں ہوتا۔

اسلام نے عقیدے میں توحید اور عمل میں مسلمانوں کی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے الٰہی اہداف ومقاصد کے حصول کے لئے اتحاد اسلامی کا سہارا لیا ہے کیونکہ کامیابی کا راز اتحاد میں مضمر ہے اور اتحاد کا ہدف اسلام کا تحفظ ہے اسی لئے اتحاد کی ضرورت اور اہمیت پر قرآن وسنت، سیرت، عقلِ عقلاء سب کا اتفاق ہے۔قرآن کریم میں جسے آفاقی و جاودانی کتاب کا درجہ حاصل ہے،،بڑی وضاحت کے ساتھ اتحاد کی طاقت وافادیت اور تفرقہ کے نقصانات بیان کئے گئے ہیں خصوصا اسلام کے پیروکاروں کو اتحاد کی تاکید کی گئی ہے اور تفرقہ سے بچنے کا کہا گیا ہے۔

ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرے میں دوسرے مسائل ومشکلات کے ساتھ ساتھ معاشرتی تقسیم اور تفرقہ بازی بھی عام تھی۔تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس دور میں مختلف قبائل کے درمیان معمولی معاملات پہ سالہا سال جنگ وجدال کا سلسلہ چلتا رہتا تھا جس کو اسلام نے باہمی اتحاد اور انسانیت کی تعظیم اور تکریم کے تحت حل کر دیا اور جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا تو جن کاموں کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دوسرے کاموں پر ترجیح دیں ان میں انفرادی اور اجتماعی وحدت کا قیام قابل ذکر ہیں۔

آپ ﷺ کی پوری کوشش رہی ہے کہ لوگ متحد رہیں اور جماعت کا شیرازہ منتشر نہ ہو، ایک پرچم تلے جمع ہوں۔ آپ ﷺ ان افراد سے نفرت کا اظہار کرتے تھے جو تفرقہ پھیلانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے حتی کفار ومشرکین اور یہود ونصاری کے ساتھ بھی آپ کا برتاؤ سخت نہیں تھا۔ دین خدا کے منکر افراد جب بحث ومباحثہ کے لئے آتے تھے تو آپ ﷺ لطافت ونرمی سے پیش آتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا حسن اخلاق اپنے تو اپنے دشمنوں کے درمیان بھی مشہور تھا۔

لوگ آپ ﷺ سے متاثر ہو کر دین مبین اسلام کو قبول کرنے لگے تھے۔ آپ ﷺ کے اس کردار پر بین ثبوت صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے جس میں اکثر صحابہ لڑنے کے لئے تیار تھے اور جنگ چھڑنے ہی والی تھی کہ آپ ﷺ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس ابھرتے ہوئے فتنہ کو دبا دیا اور تفرقہ واختلاف سے اس امت کو بچا لیا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے واضح انداز میں اعلان کیا کہ اسلام کے آنے سے پہلے اس دور کے لوگ باہمی اختلاف اور انتشار کے شکار تھے اسلام کی نعمت سے ایک دوسرے کے دلوں میں الفت پیدا ہو گئی بنابریں اسلام کا مجموعی نقطہ نظر اتحاد اور ہمدلی سے عبارت ہے۔

خداوند کریم کے بابرکت کلام قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر وحدت کی اہمیّت اور افادیّت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مسلمانوں کو وحدت واتحاد کے تنہا عامل ''حبل اللہ'' سے تمسک کی دعوت اور ہر طرح کے اختلاف سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلاَ تَمُوتُنَّ إِلاَّ وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (2) ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے اور خبردار اس وقت تک نہ مرنا جب تک مسلمان نہ ہو جاؤ اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔

آیہ کریمہ وحدت کے مقام ومنزلت کو بیان کرتے ہوئے لوگوں کو اتحاد کی طرف دعوت دے رہی ہے اور ہر طرح کے تفرقہ سے روک رہی ہے اس عمل کی شدّت کا اندازہ اس آیت میں فعل امر اور فعل نہی کے صیغوں کے استعمال سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مذکورہ آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت چار چیزوں کا حکم دیا ہے:

- تقویٰ الٰہی اختیار کرنا۔
- حالت اسلام اور تسلیم کی زندگی گزارنا۔

- حبل اللہ کو مضبوط اور جمیعاً پکڑنا یعنی باہم مل کے تھامنا ہے۔
- تفرقہ سے بچنا۔

یہی معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے سنہرے اصول ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کی رسی کو نہ صرف مضبوطی سے پکڑیں بلکہ تمام مسلمان اجتماعی شکل میں پکڑیں۔ چنانچہ اجتماعیت اور معیت دوسرا اہم فریضہ ہے۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ اجتماعی طور پر تھامنا چاہیے۔

صاحبِ تفسیر المیزان "اعتصام بحبل اللہ" کے بارے میں لکھتے ہیں: "حبل اللہ" سے مراد وہ کتاب ہے کہ جس کو اللہ نے نازل فرمایا۔ جو اللہ اور اُس کے بندے کے درمیان تعلق قائم کرتی ہے اور زمین اور آسمان کے درمیان رابطہ کرتی ہے۔ اور اگر آپ چاہیں تو کہیں حبل اللہ سے مراد قرآن اور نبی ہیں۔ (3) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نزدیک "اعتصام بحبل اللہ" سے مراد اُس (اللہ) کا دین ہے اور اس کو رسی سے تعبیر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہی رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے وہی دوسری طرف تمام ایمان والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ (4)

قرآن کا دعوت اتحاد دینا یقیناً بجا ہے کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام اسلامی فرقوں (مسلکوں) کے درمیان بنیادی و اعتقادی قدریں مشترک ہیں۔ اسلامی عقائد کا سارا نظام انہیں مشترک بنیادوں پر استوار ہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہ کسی نبی کا انکار کرتا ہے، نہ رسول اللہ کی شریعت کا منکر ہے اور نہ ہی اسلام کے سوا کسی اور دین کو مانتا ہے۔ موضوعِ بحث آیہ کریمہ میں قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ خطاب "یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" کے ذریعے، تمام اہل ایمان سے خطاب کیا گیا ہے، کسی مخصوص گروہ کو مخاطب قرار نہیں دیا گیا۔ اور جب ارشاد ہوا " وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِینَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَیْنَهُمَا" اگر مومنین کے دو گروہوں میں جنگ ہو جائے تو ان کے درمیان مصالحت و مفاہمت کروایئے۔ (5) یہاں بھی تمام مومنین کو مخاطب بنایا گیا ہے کسی مخصوص گروہ کو نہیں۔ قرآن ان اعلانات کے ذریعے مذہبی تعصب کے تنازعہ کو پائیدار بنیادوں پر ختم کر سکتا ہے جس سے آج کی انسانیت دوچار ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کریم مسلمانوں کو ایک اہم ترین عُنوان دیتا ہے اور وہ اُمت کا عنوان ہے۔ جیساکہ سورہ آل عمران آیہ/۱۱۰ میں ارشاد ہو رہا ہے: "(مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا

ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں (لیکن تھوڑے) اور اکثر نافرمان ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں مسلمانوں کو بہترین اُمت کہا گیا ہے اور اس اُمت کی خلقت کا مقصد انسانیت کی ہدایت ہے۔ تو سب سے پہلے یہ خود اُمت بنے اور اُمت، اتحاد کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اگر آج مسلمان دوسروں کی ہدایت کرنے کے بجائے خود ہدایت یافتہ نہ ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہ خود اُمت نہیں بنے اور قرآنی دستورات پہ عمل نہیں کیا ہے۔ قران میں جن دستورات کا حکم دیا گیا ہے مسلمانوں نے انہیں فراموش کر دیا ہے۔ جبکہ قرآن چودہ سو سال سے مسلمانوں کو جس خطرے کی طرف توجہ دلاتا رہا ہے وہ اختلاف ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہو رہا ہے: وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (6) اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا (اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو میں رکھو اور اگر اختلاف کروگے تو) تمہاری شان و شوکت خاک میں مل جائے گی۔ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی تم بزدل ہو جاؤگے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

اسلام کے سبب ماضی کے مسلمانوں میں اتحاد قائم ہونے کے بعد ان میں ایسی طاقت آ گئی کہ جس نے دشمنوں کو مختلف محاذوں پہ ناکامی سے دوچار کر دیا بنابر ایں اس طاقت کو یقینی طور پر مادی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے تاریخ کے دقیق مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طاقت الٰہی تھی جو کئی موارد اور مواقع پر مسلمانوں کو میسر آئی جیسا کہ سورہ انفال/۲۶ میں قرآن نے بھی اس بات کو بیان کیا ہے: "یاد کرو وہ وقت کہ جب تم تھوڑے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دیا اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا شاید کہ تم شکر گزار بنو۔"

وحدت ایک ایسا کلمہ ہے کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان محبت و شفقت پیدا ہوتی ہے، قرآن نے اصحاب پیغمبر کے بارے میں فرمایا: مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (7) محمد اللہ ﷺ کے رسول ہیں اور اُن کے ساتھی کفّار کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و مہربان ہیں۔

مفہوم وحدت فقط یہ نہیں کہ تمام مسلمان آپس میں دوستی و محبت کو برقرار رکھیں، بلکہ عملی طور پر متحد ہو کر قرآن و اسلام اور اس کے اصول سے دفاع کریں اور تفرقے کی لعنت سے خود کو بچائیں قرآن نے اسی لیے اتحاد بین المسلمین کی تاکید کی ہے اور اس کے ساتھ قرآن نے کھل کر مسلمانوں کو تفرقہ واختلاف سے بچنے کا مشورہ دیا ہے: جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ'' (8) اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہَوا اُکھڑ جائے گی۔''

وحدت اور اتحاد قرآن کی نظر میں ان واجبات میں سے ہے جس پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسلامی اتحاد عالم اسلام اور مسلمانوں کا سب سے اہم اور ضروری مسئلہ ہے اور اس کی ضرورت ہر دور اور ہر زمانے میں محسوس کی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں بڑی کثرت سے اتحاد کو قائم رکھنے اور باہمی خلفشار وانتشار سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (9) یہ تمہاری اُمت حقیقت میں ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا ربّ ہوں پس تم میری عبادت کرو۔

اس آیہ کریمہ میں تمام انسانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا اے انسانو! تم بس حقیقت میں ایک ہی امت اور ایک ہی ملت تھے۔ دنیا میں جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے بعد میں لوگوں نے اُسی دین کو بگاڑ کر مختلف راہیں اپنالیں۔ کسی نے چند احکام لئے اور اس نے اپنا راستہ الگ بنالیا کسی نے دوسرے احکام لے کر الگ راستہ اختیار کیا۔ پھر ہر ایک نے ایک جز لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس میں شامل کرلی۔ اس طرح بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ فرض کرلینا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیحیوں کے بانی تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے بانی تھے جبکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی بناء ڈالی، یہ محض ایک غلط خیال ہے۔

البتہ یہ بات کہ یہ مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف منسوب کررہی ہیں اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں کا یہ اختلاف انبیاءؑ کا ڈالا ہوا ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاءؑ مختلف مذاہب نہیں بناسکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور

کی بندگی سکھا سکتے تھے۔ آیہ کریمہ میں "ھٰذِہٖ" گذشتہ انبیاءؑ کی اُمتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو سب اللہ کے نزدیک امت واحدہ تھے اور سب کے سب ایک ہی ہدف کیلئے مصروفِ عمل رہے۔ یہ بات قابل توجّہ ہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی آیت کا مفہوم سورہ مومنون میں بھی بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ(10)اور یہ تمہاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس مجھی سے تم ڈرو۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں تمہاری اُمت ایک ہی اُمت ہے سے مراد یعنی تم ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ "اُمت" کا لفظ اس مجموعہ افراد پر بولا جاتا ہے جو کسی اصلِ مشترک پر جمع ہو۔ انبیاء کرامؑ چونکہ اختلاف زمانہ و مقام کے باوجود ایک عقیدے، ایک دین اور ایک دعوت پر جمع تھے اس لئے فرمایا گیا کہ ان سب کی ایک ہی اُمت ہے۔

قرآن کے اس اہم موضوع یعنی "وحدت المسلمین" کو منتخب کرنے کا مقصد مسلمانوں کے درمیان تفرقہ انگیز کوششوں کو حوصلہ شکنی اور اُنہیں سے بُرے نتائج سے باخبر رکھنا ہے۔ کیونکہ اتحاد ایسی طاقت ہے جس کے ذریعے تاریخ عالم میں مختلف اقوام نے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو لوٹایا ہے۔ سر زمین مکہ میں بھی اسلام کی آمد کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو وحدت کی تعلیم دی اور آپ نے ابتدائے اسلام میں پیش آنے والے کٹھن اوقات میں بھی کمال اتحاد کے ساتھ اپنے مشن کو جاری و ساری رکھا۔

مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد مختلف اقوام اور قبائل کے ساتھ کئے گئے معاہدے بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام شروع سے ہی اتحاد کا علمبردار رہاہے اور دیگر مذاہب کے ساتھ بھی اتفاق باہمی کے اصول کے تحت وحدت واتحاد کاحامی رہا ہے۔ قرآن و احادیث میں اتحاد و وحدت خود اس بات کا مظہر ہے کہ مسلمانوں کی ترقی میں جہاں اسلامی تعلیمات پر مکمل طورپر عمل ایک جاندار وجہ رہی ہے وہاں مختلف خطرات سے محفوظ رہنے کیلئے اور ریاست کے اندر امن کی بقاء کیلئے اتحاد کو بھی ایک کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حیات رسول اللہ ﷺ اور اس کے بعد بہت کم عرصے میں سر زمین عرب اور اطراف میں اسلام کا پرچم لہرا دیا گیا۔ لیکن آج مسلمان زوال کی طرف ہیں اس لئے کہ اس زوال

کے پیچھے جہاں بہت ساری وجوہات کارفرمارہی ہیں وہاں مسلمانوں کا غیر ضروری چیزوں میں الجھ کر اندورن خانہ اپنی طاقت کو تفرقہ اندازی کی نذر کرنا بھی ایک وجہ ہے۔ مسلمان اسلام کے تمام اصولوں پر متفق ہونے کے باوجود غیر ضروری اور فروعی و جزئی اختلافات کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان اُٹھارہے ہیں۔

آج صورت حال اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ مسلمان آج ایک دوسرے کو مسلمان قبول کرنے کیلئے بھی تیار نہیں۔وہ دوسروں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کیلئے اپنی طاقت کو استعمال کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کیلئے زور آزمائی کررہے ہیں۔ صاحبِ شعور مسلمان اس بات پر حیران و پریشان ہیں کہ تفرقہ کی اس بیماری نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ایک طرف مخالفین کی نہ رکنے والی جارحیت ہےتو دوسری طرف مسلمانوں کے آپس میں فروعی اختلافات نے اسلام و مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ آج دشمنان اسلام اپنے تمام اصولی و فروعی اختلافات کے باوجود اسلام کے خلاف متحد نظرآتے ہیں، لیکن مسلمان دینی مفاد کیلئے ایک نظر نہیں آتے۔

آج فلسطین، کشمیر، برما، شام، افغانستان، یمن نہ جانے کتنے مسلم ممالک کے مظلوموں کی دل دہلا دینے والی آہ وبکا، جنازوں پر نوحہ کناں ماوں اور بہنوں کو پوری دنیاہر روز میڈیا پر دیکھ رہی ہے، مگر مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا یہ سب کچھ اس لیے کہ مسلمان متحد نہیں اور مسلمانوں کو اُمت واحد ہونے کے باوجود قرآن اور پیغمبر اکرم ﷺ کی تعلیمات کا کوئی لحاظ نہیں۔

**خلاصہ کلام**

- اتحادایک اسٹریٹجی وحکمت عملی کے علاوہ شرعی ضرورت بھی ہے جس کا ثبوت قرآنی نصوص میں موجود ہے۔
- شارعِ مقدس نےاسلامی اتحاد اور بھائی چارے کی طرف خاص توجہ دی ہے اور یہ اسلام کے اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔
- اسلام دین وحدت ہے اور اسلام اپنے تمام ماننے والوں کو متحد دیکھنا چاہتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان متحد ہونے کی صورت میں دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکی ہے اور نہ کرسکے گی۔

- قوموں کی کامیابی کا راز ان کا آپس میں اتفاق واتحاد رہا ہے۔
- امت مسلمہ میں انتشار اور فرقہ واریت کا ذریعہ بنناالله اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں سخت ناپسندیدہ ہے۔
- وحدت اسلامی سے مراد یہ نہیں ہے کہ اسلامی مذاہب میں سے ایک کا انتخاب کر لیا جائے یا تمام مذاہب کے مشترکات کو لے لیا جائے اور اختلافات کو چھوڑ کر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جائے بلکہ مسلمانوں کو مختلف مذاہب میں ہونے کے ساتھ ساتھ دشمن کے مقابلہ میں متحد ہونا ہے چونکہ اسلامی مذاہب کی راہیں مختلف ضرور ہیں مگر منزل ایک ہے۔

## چند مفید تجاویز

- مختلف موضوعات سے متعلق شیعہ، سنی روایات کو اکٹھا کرکے چھپوایا جائے۔
- تقریب مسالک کے موضوع پر مختلف زبانوں میں چینلز چلانے اور نئی کتابیں چھپوانی چاہیے۔
- متنازع مسائل کی اشاعت سے گریز کیا جانا چاہیے۔
- اسلامی ممالک میں مسلکی بنیادوں پر موجود اختلافات کی بنیاد پر کسی کو کافر، مشرک یا واجب القتل قرار دینے کی روایت ختم ہونی چاہیے جس سے معاشرے میں بدامنی و فساد اور عدم برداشت کا رویہ فروغ پا رہا ہے۔
- قتل وغارت پر قابو پانے کے لئے کسی قسم کی رعایت نہ برتی جائے۔
- قتل کی حرمت کے حکم پر مبنی آیات جیسا کہ مَنْ قتل نَفْساً۔۔۔(مائدہ ۳۲) اور خودکشی کی ممانعت کی آیت جیسا کہ وَلا تقتُلُوا انفسکم۔۔۔(نساء ۲۹) جیسی آیات سے قوم کو آگاہ کیا جائے۔
- اسلامی ممالک کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ تمام اہل علم کو یکجا کرکے ان سے بین المسالک ہم آہنگی کی فضا پیدا کروانے میں اپنا کردار ادا کرے۔
- موجودہ دور میں میڈیا کی اہمیت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا اس لئے لازم ہے کہ الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا معاشرے میں اتحاد پیدا کرنے والی سرگرمیوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں اور جن امور سے معاشرے میں تفریق جنم لینے کا یقین یا اندیشہ ہو اس کو میڈیا پر لانے سے گریز کیا جائے۔

*****

# حوالہ جات

1۔ابو عبداللہ محمد اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، ج۲، کتاب تفسیر، باب قولہ یقولون لئن رجعنا الی المدینہ۔۔۔ح ۲۰۱۲، ص ۱۰۴۰۔۱۰۴۱ ترجمہ وحید الزمان، مکتبہ رحمانیہ لاہور

◈ سبحانی تبریزی، جعفر، فروغ ابدیّت، ج ۲، قم، بوستان کتابِ قم، چاپ بیست ویکم ۱۳۸۵،

◈ سیرت النبی کامل، ابن ہشام، ترجمہ عبدالجلیل صدیقی، ج ۲، ص ۳۴۶

◈ ابو جعفر محمد بن جریر طبریّ، تاریخ طبری، ج ۲، ص ۶۰۴

◈ سھیلی، عبدالرحمٰن بن عبداللہ الخثعمی، الروض الانف فی تفسیر السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، ج ۴، دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۔۱۵

2۔سورہ آل عمران، آیت: ۱۰۲۔۱۰۳

3۔سید محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۳، موسسہ اسماعیلیان ایران قم، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۱۲ھ، ص: ۳۶۹

4۔مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص: ۲۷۶

5۔سورہ حجرات، آیت: ۹

6۔سورہ انفال، آیت: ۴۶

7۔سورہ فتح، آیت: ۲۹

8۔سورہ انفال، آیت: ۴۶

9۔سورہ انبیاء آیت: ۹۲

10۔سورہ مومنون، آیت: ۵۲

# تصوّرِ مذہب کے مختلف نظریے

حنا خراسانی رضوی*
hinakhorasanyrizvi@yahoo.com

**کلیدی کلمات:** ارواح پرستی، مظاہر پرستی، فطرت پرستی، سحر پرستی، شامن یا پروہت، بت پرستی، توحید

## خلاصہ

مذہب کیا ہے؟ اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق کی مدت کتنی ہے؟ کیا ابتداء ہی سے یہ انسانی فکر کا حصہ تھا یا پھر انسان نے زمین پر آباد ہونے کے بعد رفتہ رفتہ اس سے واقفیت حاصل کی؟ یہ وہ موضوعات ہیں جو ہمیشہ اور ہر دور میں زیرِ بحث رہے ہیں۔ خواہ قدیم دور کے عظیم فلسفی و مفکرین یا جدید دور کے سائنسدان، سب نے اپنے اپنے انداز میں مذہب کی حقیقت اور اس کے اسرار جاننے کی جستجو کی ہے۔ اسی فکر و جستجو کے باعث آج بہت سے اسرار و معمے سلجھے نظرآتے ہیں جو ماضی میں حیرت و استعجاب کا سبب تھے اور نہ سمجھ میں آنے والی توجیہ کے باعث ماورائے عقل سمجھے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر چاند اور سورج کو کئی قدیم قوموں میں معبود کا درجہ حاصل تھا۔ جن کے آگے جھک کر بندگی کا اظہار کیاجاتا اور مرادیں مانگی جاتیں۔ انہیں خوش کرنے کیلئے طرح طرح کے جتن کئے جاتے اور ان کی ناراضگی سے ڈر اور خوف محسوس کیاجاتا اور اسے تباہی اور بربادی کا باعث سمجھاجاتا تھا، لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ یہ چاند و سورج کوئی معبود نہیں بلکہ اس وسیع و عریض کائنات کا معمولی حصہ ہیں۔

*۔ ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اُردو لغت میں مذہب کے معنی ''راستہ یا طریقہ'' کے ہیں۔(1) عام طور پر مذہب کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ یہ کہ مافوق الفطرت قوت کی اطاعت، عزت اور عبادت کے لئے بااختیار تسلیم کرنے کا عمل مذہب ہے۔انسائیکلو آف ریلیجن اینڈ ریلیجنز(*Encyclopedia of Religion And Religions*) میں مذہب کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

*''Religion is a complex of doctrines and practices and institutions.It is a statement of belief, in gods and God''(2).*

مذہب عقائد، عمل اور اداروں کا ایک مجموعہ ہے۔یہ ایمان کا اظہار ہے خداؤں پر اور خدا پر۔

دنیا میں مذاہب کی تعداد کا تعین اس کی کثرت کے باعث ناممکنات میں شمار کیا جاتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد ہزاروں پر مشتمل ہوگی۔ ان میں کچھ مذاہب ایسے ہیں جن کے پیروکاروں کی تعداد کروڑوں تک پہنچی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ماننے والوں کی تعداد سو دو سو سے اوپر نہیں۔مذہب کی کثیر تعداد کی بدولت انہیں پہچان دینے کے لئے مختلف حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جو مذاہب خدائے واحد پر یقین رکھتے ہیں انہیں توحید پرست مذاہب (*Monotheistic*) کہا جاتا ہے۔ بت پرستی اور بے شمار دیوی دیوتاؤں کے قائل مذاہب، کثرت پرست یا بت پرست (*Polytheisti*) کہلاتے ہیں۔ وہ مذاہب جو کئی خداؤں کے ساتھ ساتھ ایک برتر خدا کے وجود پر بھی یقین رکھتے ہیں انہیں (*Theistic*) کا نام دیا جاتا ہے۔

ایسے مذاہب جن میں خدا کا تصّور واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا ہو ان کے لئے(*Non Theistic*) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ بعض مذاہب ایسے ہیں جو دو قوتوں، خیر و شر یا نیکی و بدی کے خداؤں کے قائل ہیں، انہیں(*Dualistic*) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بیشمار خداؤں کی موجودگی میں سب سے بہتر اور طاقتور خدا کو قابلِ پرستش ماننے والے مذاہب(*Henotheistic*) کہے جاتے ہیں۔ جرمنی کے اسکالر برائے مذہبیات و لسانیات فریڈرچ میکس میولر (*Friedrich Max Muller*، ۱۹۰۰ء-۱۸۲۳) اس اصطلاح کو قدیم مصر کے فرمانرواں عامون حوطپ چہارم المعروف اخناطون کے مذہب کے لئے مختص کرتے ہیں جس نے مصر میں پہلی مرتبہ خدائے واحد ''عاطون'' کی پرستش رائج کی تھی۔

برطانوی ماہر بشریات ای بی ٹیلر (Sir Edward B. Tylor، ۱۸۳۲ء۔۱۹۱۷ء) ۱۸۷۱ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب Primitive Culture "مظاہر پرستی اور اس میں موجود روح کے تصور" کو انسان کے مذہب کی ابتداء قرار دیتے ہیں۔ جسے وہ Animism کا نام دیتے ہیں۔ ٹیلر اپنے نظریئے کے حق میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حالتِ نیند میں خواب دیکھنے کے عمل نے انسان کی فکر میں روح کے تصور کو جنم دیا۔ ابتدائی انسان کے لئے خواب پراسرار اور نہ سمجھ میں آنے والا عمل تھا۔ جس میں وہ اپنے ان عزیز و اقارب کو بھی زندہ انسانوں کی مانند روز مرّہ کے کاموں میں مشغول پاتا تھا جو موت کے باعث حرکت سے بھی عاجز تھے۔

علاوہ ازیں یہ مردہ عزیز و اقارب حالتِ خواب میں فائدہ و نقصان یا خطرے سے متعلق پیشن گوئی حاصل کرنے کا بھی ذریعہ تھے۔ اس صورت حال سے اُن ابتدائی انسانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جسم کا بے حرکت ہو جانا یعنی موت، اختتام نہیں ہے بلکہ اصل چیز روح ہے جو فنا نہیں ہوتی بلکہ موت کے بعد جسم کی قید سے آزاد ہو کر کسی اور دنیا میں چلی جاتی ہے اور وہاں مصروفِ عمل رہتی ہے۔

ٹیلر کے مطابق روح کا تصور صرف انسانوں ہی کے لئے مختص نہیں تھا بلکہ مظاہرِ فطرت میں موجود ہر شئے، پہاڑ، دریا، پتھر، بارش، درخت، ہوا، دریا، مٹی اور جانور روح کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ روحوں کے ساتھ یہ تصّور بھی منسلک تھا کہ یہ زندہ انسانوں کو نفع نقصان پہنچانے کا سبّب بھی بن سکتی ہیں۔ اسی تصّور کے پیشِ نظر انسان ان کی خوشی اور ناراضگی کے تصّور سے آگاہ ہوا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس نے ان کی خدمت میں قیمتی تحائف اور نذرانے پیش کیے اور ان کی ناراضگی سے بچنے کے لئے مناجات و بھجن کے ذریعے منت سماجت سے کام لیا۔ یہی اعمال آگے جا کر مذہب کی بنیاد بن گئے۔ (3)

فطرت پرستی انسان کی اولین تصّورات میں سے ہے۔ انسان نے فطرت میں موجود ہر اس شئے کو قابلِ تعظیم سمجھا جو اسے فائدہ یا نقصان پہچانے کا سبّب بنی۔ ان میں چاند، سورج، ستارے، پیڑ پودے، آگ ہوا اور پانی تک شامل ہیں۔ سرد علاقوں میں سورج پرستی کے آثار ملتے ہیں اور گرم علاقوں میں چاند کی پرستش کے۔ جرمن ماہرِ مذہبیات فریدرک میکس میولر Friedrich Max Muller (۱۸۲۳ء۔۱۹۰۰ء) مذہب کی ابتدا کا محرّک، انسان کا فطرت میں موجود طاقتوں کے تصّور پر غور کو قرار دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ان کا ماننا ہے کہ ابتدائی انسان کے لئے موسموں کی تبدیلی، رات و دن کا چکر، چاند کا گھٹنا وبڑھنا اور موجوں کے اتار چڑھاؤ جیسے فطرت کے مظاہرے حیرت انگیز اور متاثر کن تھے۔ اس نے انہیں پہچان دینے کے لئے مختلف نام دے رکھے تھے اور ان سے منسوب قصے و کہانیاں بنا رکھی تھیں۔ جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی رہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دیوی دیوتاؤں سے منسوب ہو کر مذہب کے تصور میں ڈھل گئے۔ میولراس کی مثال قدیم یونانی قصوں میں موجود سورج دیوتا اپولواور صبح صادق کی دیوی ڈیفینی کی مثال پیش کرتے ہیں کہ یونانی عقائد کے مطابق دیوتا اپولو، دیوی ڈیفنی سے محبت کرتا تھا لیکن ڈیفینی اس سے خائف رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ڈیفینی کو پکڑنے کے لئے اپولواس کے پیچھے بھاگا مگر وہ ہاتھ نہ آئی اور اس سے دور بھاگ گئی۔ پھر یہ سلسلہ ہمیشہ یوں ہی چلتا رہا کہ جب بھی اپولو (سورج) آتا تو ڈیفینی (سویرا) غائب ہو جاتی۔ (4)

ٹیبو(Taboo) کو بھی مذہب کی ابتدا کا ایک عنصر مانا جاتا ہے جو بہ یک وقت مقدّس و پاکیزہ، متبرک، پراسرار، خطرناک، منحوس، پاک، ناپاک اور حلال وحرام کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جرمن فلسفی و ماہرِ نفسیات میکس ونٹ Wilhelm Maximilian Wundt (۱۸۳۲ء۔۱۹۲۰ء) ٹیبو کو تمام مذاہب سے قدیم اور اس زمانے کی یادگار مانتے ہیں جب انسانی ذہن میں کسی خدا یا دیوتا کی کوئی شبیہہ موجود نہیں تھی۔ ان کے نزدیک ٹیبو دراصل ابتدائی انسانوں کا بدروحوں پر اعتقاد کا اظہار ہے جو ہر اس چیز میں موجود ہوتی ہیں جنھیں ٹیبو قرار دیا گیا ہو۔ ان ٹیبو کو چھونا یا ان کا غلط استعمال، خواہ وہ مقدّس ہوں یا ناپاک ہولناک نتائج کا باعث بن سکتے ہیں۔

آسٹریائی ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ Sigmund Freud (۱۸۵۶ء۔۱۹۳۹ء) اپنے مشہورِ زمانہ مضمون ''Totem And Taboo'' میں ٹیبو کی وضاحت '' حرام اور ممنوع'' کے معنوں میں کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ٹیبو کا اطلاق ان اعمال پر ہوتا ہے جس کی کسی قوم، قبیلے یا مذہب میں سخت ممانعت کی گئی ہو اور اس کی انجام دہی گناہِ کبیرہ کا باعث خیال کی جاتی ہو۔ پولینیشیا، ملینیشیا اور افریقہ کے وحشی قبیلوں میں اب بھی ٹیبو کی حد درجہ پابندی کی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کڑی سزا کا موجب قرار دی جاتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کو جنھیں پیدائش اور دوسرے نسوانی مسائل کے باعث ٹیبو سمجھا جاتا ہے۔

اس دوران ان پر مقدّس جگہوں پر جانے اور مقدّس اشیاء کو چھونے کی سخت پابندی عائد ہوتی ہے۔ افریقہ کے بعض علاقوں میں عورتوں کو ان مسائل کی مدّت تک ناپاک سمجھتے ہوئے آبادی سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی نحوست کے اثرات قبیلے کے کسی شخص پر نہ پڑیں۔ اسی طرح ان اقوام میں مُردوں کو بھی ٹیبو سمجھا جاتا ہے اور ان سے بچنے اور انہیں جلد سے جلد دفنانے یا ٹھکانے لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مُردوں کو ہاتھ لگانے یا دفنانے والا بھی مخصوص مدّت تک کے لئے ٹیبو قرار دیا جاتا ہے اور اس عرصے میں اس پر اپنے گھر میں داخلے پر بھی پابندی عائد ہوتی ہے۔

ٹیبو کی ایک قسم مانا (Mana) کہلاتی ہے۔ جس سے مراد مظاہرِ فطرت میں پائی جانے والی ایک پراسرار روحانی قوّت" شوریگا" ہے۔ اس قوّت کے حامل قبیلے کے کچھ خاص افراد ہوتے ہیں جو اس کے ذریعے مظاہرِ فطرت میں موجود ارواح سے تعلق جوڑ لیتے ہیں اور انہیں اپنا تابع کر لیتے ہیں۔ قبیلے کے عام افراد اُن خاص افراد کے ذریعے اس قوّت کو حاصل کر سکتے ہیں خصوصاً بیماری اور بری ارواح و بلاہیات کو دور بھگانے کے لئے ان خاص و مقدّس افراد کو چھونا، دیکھنا یا ان کا جھوٹا کھانا پینا مفید سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں ملینیشیا کے مقامی باشندوں میں بھی مانا کا رجحان پایا گیا۔

دورِ جدید میں مذاہب کے موضوع پر لکھی گئی کتاب Religions Of The World کے مصنف لیوس مور Lewis M. Hopfe (۱۹۳۵۔ ۱۹۹۲ء) نہ صرف قدیم انسانوں میں مظاہرِ فطرت میں موجود اشیاء کو مقدّس اور لائقِ تعظیم سمجھنے کے رجحان کی تائید کرتے ہیں بلکہ وہ اس کے اثرات جدید مذاہب میں بھی بدرجہ اتم موجود پاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

*"Modern people place historic stones at the corners of their new buildings.....Christians bring evergreen trees in to their homes to celebrate christmas, knowing full well that there is no basic connection between an ever green tree and the birth of Jesus, Muslim march around the sacred black stone and kiss it during their pilgrimage to Mecca, Hindus seek to bathe in the sacred river Ganges, The Parsee bring gifts of sandalwood to be burned in the sacred fire"(5)*

دورِ حاضر کے لوگ اپنی نئی عمارتوں کے کونوں پر تاریخ کے سنگ گاڑھ دیتے ہیں ۔۔۔۔ عیسائی کرسمس منانے کے لئے اپنے گھروں کے اندر سدابہار شجر لگاتے ہیں حالانکہ وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ اس سدابہار کے شجر اور یسوعؑ کی پیدائش میں کوئی بنیادی ربط نہیں۔ مسلم حج کے دوران مقدس سیاہ پتھر (حجراسود) کے گرد چکر لگاتے اور اسے چومتے ہیں، ہندو گنگا کے مقدس دریا میں نہانے کے مشتاق ہوتے ہیں اور پارسی صندل کی لکڑی مقدس آگ کی نظر کرتے ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے ماہرِ بشریات سر جیمز فریزر (Sir James G. Frazer ۱۸۵۴ء۔۱۹۴۵ء) جادو اور سحر (Mazic) کو مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ فریزر کے نزدیک جادو اور سحر آج ہمارے درمیان فریبِ نظر سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ جو لوگوں کو تفریح فراہم کرنے کے لئے ایک بازیگر انجام دیتا ہے لیکن ابتدائی لوگوں کے درمیان اسے نہایت اہمیت حاصل تھی۔ ان کی نظر میں جادو اور سحر خصوصی عملیات پر مشتمل وہ عمل تھا جس سے نہ صرف فطرت کے پرجوش مظاہرے، آندھی و طوفان، بارش و بادو باراں اور زلزلے و سیلاب کو اپنے اختیار میں کیا جاسکتا تھا بلکہ مظاہرِ فطرت میں موجود روحوں کو لبھا کر و افر شکار کی دستیابی اور دشمن پر غلبہ جیسی مطلوبہ مرادیں بھی پوری کی جاسکتی تھیں۔ یہ جادوئی اعمال آگے جا کر دیوی دیوتاؤں کی فوق البشر ہستی یا ہستیوں کی پرستش میں تبدیل ہو کر مذہب کی بنیاد بن گئے۔

دنیا کی کئی قوموں میں جادو و سحر کا استعمال زراعتی امور کے لئے لازمی سمجھا جاتا تھا۔ قدیم زمانے سے خوراک کا حصول انسان کا بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ یورپ اور مغربی ایشیا سے بہت سی چھوٹی چھوٹی حاملہ عورتوں کی مورتیاں دریافت ہوئی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فصلوں کی بہتر پیداوار کی خاطر کی گئی رسومات سے منسلک تھیں۔ تخلیق کا منبع ہونے کے باعث افزائشِ فصل کو عورتوں کی ذات سے منسلک سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے انسان کا اولین معاشرتی نظام مادرانہ تھا اور معاشرے میں اسے مادرِ ارض کا مقام حاصل تھا۔ دینا کی کئی قدیم قوموں سے مادرِ ارض کی مورتیاں دریافت ہوئیں ہیں۔ جن میں ایران، اٹلی، بلقان، سندھ، شام، عراق، فرانس، فلسطین، کریٹ، مصر اور یونان شامل ہیں۔ ان میں سب سے قدیم فرانس کے کرومیگنن کے غار سے دریافت شدہ پچیس ہزار سال پرانی مورتی ہے

جسے وینس آف ویلن ڈروف کا نام دیا گیا ہے۔ علمائے آثار کی متفقہ رائے ہے کہ یہ مادرِ ارض کی مورت ہے جو افزائشِ نسل و فصل کی ساحرانہ رسوم میں استعمال کی جاتی تھی۔

دنیا میں آج بھی مادر آنہ نظام کی یادگار ملتی ہیں۔ امریکہ کے مقامی اور نیکو قبیلے کے افراد آلو و جوار مکئی بونے کا کام اپنی عورتوں سے لیتے ہیں۔ ان کے خیال عورتیں فصل اگانے کے بارے میں مردوں سے بہتر جانتی ہیں اور افزائشِ نسل کی بدولت ان کے ہاتھوں میں برکت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش کے سرحدی علاقے کی کھاسی قبیلے میں خاندان کی سربراہ اور جائیداد کی وارث عورت ہوتی ہے اور خاندانی نسل اس کے نام سے چلتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مر جاتا ہے تو اس کی ہڈیاں اس کی ماں کے قبیلے کو دی جاتی ہیں۔ یہودی مذہب میں بھی نسل ماں کے نام سے چلتی ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ زیورات پہننے کے پیچھے بھی جادو و سحر کی منطق کارفرما ہے۔ قدیم معاشروں میں ارواح خبیثہ سے خود کو محفوظ رہنے کے لئے جانوروں کے دانتوں، ہڈیوں اور پتھروں کو تراش کے پہنا جاتا تھا۔ ان کا استعمال نہ صرف زندوں کے لئے مفید تھا بلکہ مردوں کے لئے بھی اہمیت کا حامل تھا۔ ہجری دور کے غاروں میں مدفون مردوں کے ساتھ ایسی کئی اشیاء دریافت ہوئی ہیں۔

قدیم معاشرے میں جادو و سحر کے عمل کو قبیلے کے تجربہ کار اور بہادر شخص کی سربراہی میں انجام دیا جاتا تھا۔ جسے شامن (Shaman) کہا جاتا تھا۔ جنوبی فرانس میں ٹرائز فریرز (Trois Freres) (نامی غار کی اندرونی دیوار میں انسانی ہاتھوں سے بنی پندرہ ہزار سال پرانی تصویر دریافت ہوئی ہے جس میں شکار کی خاطر کیے جانے والے جادوئی عمل کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس تصویر میں جادوگر یا شامن کو شکار پر حملہ کرنے کے انداز میں جھکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک نقلی چہرہ لگا ہوا ہے جس کی آنکھیں اور کان اُلو سے مشابہہ ہیں۔ اس کے سر پر بارہ سنگھے کے سینگ ہیں۔ بدن، پیٹ کندھے اور اگلی دو ٹانگیں شیر کی طرح اور پچھلی دونوں ٹانگیں انسان کی طرح ہیں۔

ماہرین آثار کا بھی ماننا ہے کہ اس طرح کے جادوئی طور طریقوں پر مشتمل تمثیلی عمل کی انجام دہی ابتدائی انسان کو اپنے مقاصد میں کامیابی کا کامل یقین دلانے کا سبّب بنتے تھے۔ یہ جادوگر یا شامن قبیلے میں بہ یک وقت طبیب، جادوگر، قصہ گو اور روحانی پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے فرائض میں موسم کی تبدیلیوں

کا مطالعہ کرنا اور ان کے اثرات سے آگاہی رکھنا، علاج معالجے کے لئے جڑی بوٹیاں تلاش کرنا، شکار کی بہتات، آفاتِ سماوی، دشمنوں سے بچاؤ اور روحانی معاملات کے لئے مختلف جادوئی اعمال کی انجام دہی کرنا شامل تھا۔

روحانی معاملات میں یہ شامن فطرت میں موجود روحوں سے رابطہ کر کے لوگوں کے علاج معالجے، مستقبل کی پیشن گوئیاں اور موت سے منسلک رسوم لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ لوگ بھی اس بات کے قائل تھے کہ شامن مخصوص جادوئی عمل کے ذریعے مرنے والے کی روح کی صحیح سمت کی جانب رہنمائی کرتے تھے اور اگر کوئی مُردہ ان رسموں سے محروم رہ جائے تو اس کی روح دنیا کی بھول بھلیوں میں گھر جاتی اور دوسری دنیا تک نہیں پہنچ پاتی۔

سحر یا جادو سے مشابہت رکھنے والے عملیات آج کے جدید معاشرے میں بھی اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ نیکی اور بدی دونوں طرح کے کاموں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ بدی کی خاطر کیے جانے والے عمل کو " سفلی " کہا جاتا ہے جس کے ذریعے دشمن کو تکلیف پہنچا کر اسے زیر کیا جاتا ہے۔ اس عمل کے لئے مٹی کے پتلے یا کپڑے کی گڑیا کا استعمال کیا جاتا ہے۔ عامل یہ تصّور کرتا ہے کہ جو کچھ پتلے یا گڑیا کے ساتھ کیا جائے گا وہ براہ راست دشمن پر اثر انداز ہوگا۔ یعنی پتلے یا گڑیا کے کسی عضو کو تکلیف پہنچائی جائے تو دشمن کے بھی اس عضو میں تکلیف پہنچے گی اور اگر دشمن کی ہلاکت مقصود ہو تو پتلے یا گڑیا کو مکمل طور پر برباد کر دیا جاتا ہے۔ جیمز فریزر کے مطابق جنوبی امریکہ کی ریاست پیرو کے مقامی باشندے اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے چربی میں اناج کے دانے ملا کر پتلے بناتے ہیں اور انہیں دشمن کی گزرگاہ پر جلاتے ہیں تاکہ دشمن جلنے کی اذیت محسوس کر کے ہلاک ہو جائے۔ (6)

اسی طرح مغربی افریقہ میں ایسی عورتیں جن کے شوہر فوج کے ساتھ دشمن سے لڑنے گئے ہوں وہ اپنے جسم پر سفید رنگ مَل کر بہت سارے تعویذ پہن لیتی ہیں اور خربوزے سے مشابہہ ایک پھل کو چھریوں سے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہیں جیسے وہ دشمنوں کے سر اڑا رہی ہوں۔ اس عمل کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ جیسا سلوک ان پھلوں کے ساتھ کریں گی ویسا ہی سلوک ان کے شوہر اپنے دشمنوں کے ساتھ کریں گے۔ (7)

بھلائی کی خاطر کیے گئے جادوئی عمل کو ٹونے اور ٹوٹکے کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اسے "ووڈو" (Voodoo) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

دنیا میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ دونوں طرح کے معاشرے میں ان ٹونے ٹوٹکوں پر یقین رکھا جاتا ہے جس کا مظاہرہ ان کے معمولاتِ زندگی میں باآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ جیمز فریزر اس سلسلے میں برطانوی کولمبیا کے مقامی انڈینوں کی مثال پیش کرتے ہیں جو اپنی گزر بسر کا انحصار دریااور سمندر سے حاصل ہونے والی مچھلی پر رکھتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے دریاؤں میں مچھلی کی قلّت ہونے لگتی ہے تو شامن یا پروہت ایک تیرتی ہوئی مچھلی کی مورت بنا کر اسے پانی میں اس سمت میں ڈال دیتے ہیں جہاں سے عموماً زیادہ مچھلیاں تیرتی ہوئی آتی ہیں۔ اس عمل کے بعد انہیں دریا میں مچھلی کی فراوانی کا کامل یقین ہو جاتا ہے۔(8)

جاپان میں بھی خشک سالی کے دنوں میں مشکیزوں یا کسی برتن میں پانی بھر بھر کر اوپر سے پھینکا جاتا تھا جس کا مقصد یہ ہوتا کہ فطرت ان کی تقلید میں پانی بہتا دیکھ کر آسمان سے پانی (بارش) برسائے گی۔ چین میں لمبی عمر پانے کے لئے اپنی زندگی میں اپنا کفن سلوا لینے کا رواج پایا جاتا ہے۔ جسے کسی ایسی کنواری اور نوجوان لڑکی سے سلوانے کو فوقیت دی جاتی جس کے کئی سال تک زندہ رہنے کے امکانات ہوتے۔ چینی عقیدے کے مطابق یہ عمل ان کی زندگی میں بھی کئی سال کے اضافے کا باعث بن جاتا ہے۔ برّ صغیر پاک و ہند میں کالی بلی کو آسیب یا نحوست سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ رستے میں اگر سامنے سے کالی بلی گزر جائے تو کسی کام کے بگڑنے کا خدشہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مغربی دنیا میں کوہی کو منحوسیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

سحر و جادو کی ایک اور قسم فیٹش پرستی (Fetishism) ہے جو ابتدائی مذاہب میں پائی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی خاص قوّت مانی جاتی ہے جس سے فطرت کو قابو کرکے بارش برسوائی جاسکتی ہے، اناج کی افزائش اور شکار کی بہتات کرائی جاسکتی ہے۔ اس قوت کی حامل کوئی بھی شئے ہو سکتی ہے مثلاً کسی درخت کی شاخ، چھوٹے بڑے پتھر، انسانی و حیوانی ہڈی اور پرندوں کے پر وغیرہ۔

جرمن فلسفی اور ماہرِ بشریات لدوگ فیوربخ (Ludwig Feurbach، ۱۸۰۴ء۔۱۸۷۲ء) مذہب کو انسان کی اپنی خواہشات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس نظریئے کی تائید نظریہ اشتراکیت کے داعی پروفیسر کارل مارکس (Karl Marx، ۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

*"Man makes religion, religion does not make man . Religion is the self-consciousness and self-esteem of man who has either not yet found himself or has already lost himself again... Religion is the sigh of the*

*oppressed creature, the heart of a heartless world, just as it is the spirit of spiritless conditions. It is the opium of the people (9).*

''انسان مذہب کو بناتا ہے مذہب انسان کو نہیں ۔مذہب ایک ایسے انسان کی خود آگاہی اور خود اعتمادی ہے جس نے یا تو ابھی تک خود کو پایا نہیں ہے یا پھر خود کو دوبارہ کھو دیا ہے ۔مذہب مظلوموں کی آہ ہے ۔ایک بے رحم دنیا میں رحم دلی ہے اور غیر روحانی حالات کی روحانیت ہے۔ یہ لوگوں کے لئے ایک نشہ ہے۔''

سگمنڈ فرائیڈ بھی ان دونوں کی حمایت کرتے ہیں اور مذہب، اخلاق اور معاشرے کی جڑوں کو انسان کے احساسِ جرم میں پنہاں قرار دیتے ہیں۔ اس کی مثال وہ یوں دیتے ہیں کہ معاشرے کی ابتدائی ترین شکل بیٹوں کی صورت میں اس جتھے یا غول کی تھی، جس کا سربراہ یا نگران ان کا باپ تھا۔ جتھے میں اس کی حیثیت طاقتور اور سخت گیر آمر حکمران کی سی تھی۔ اس نے بیٹوں پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس کے نتیجے میں بیٹے باپ سے متنفّر اور خائف تھے۔ اسی نفرت اور خوف کے نتیجے میں ایک دن تمام بیٹوں نے مل کر اپنے آمر باپ کو قتل کر دیا لیکن جب وراثت کا مسئلہ سامنے آیا تو کوئی بھی بیٹا طاقت اور عظمت میں باپ کے برابر نہیں تھا جو اس کی جگہ لے سکتا۔ تب بیٹے اپنے عمل پر شرمندہ ہوئے اور اس احساسِ ندامت کو مٹانے کے لئے انہوں نے باپ کو لافانی دیوتا یا خدا تسلیم کر لیا اور وراثت سے دستبردار ہو کر الگ الگ قبیلوں کی بنیاد رکھی جو ٹوٹم پرستی Totemism کے اصولوں پر قائم کیا گیا۔ یہی ٹوٹم پرستی انسان کے مذہب کی ابتدا کا سبّب بنی۔ ٹوٹم کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

*"A totem is an animal,reptile,insect,or plant that is emblematic ofhe community and is treated as sacred.The relationship between totems and hummans reveals a special circle of kinship and connection between hummans and the rest of nature (10)".*

ٹوٹم سے مراد کسی شئے کو مقدّس اور قابلِ تعظیم سمجھنا کے ہیں۔ اس میں چرند پرند، کیڑے مکوڑے اور پیڑ پودے ، وغیرہ سب شامل ہو سکتے ہیں۔ جسے کسی قبیلے میں مقدّس اور لائقِ پرستش سمجھنے کے علاوہ قبیلے کے جدامجد کی حیثیت بھی حاصل تھی۔

تاہم سگمنڈ فرائیڈ کے مطابق ابتدائی قبیلوں میں ٹوٹم عموماً کوئی جانور ہی ہوتا تھا جو دراصل مقتول باپ کے نعم البدل کے طور پر موجود تھا۔ جس کی صفات میں شامل تھا کہ وہ انہیں مستقبل سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا، خطرات سے آگاہ کرتا اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کرتا تھا۔ جس طرح ایک باپ اپنے بچوں کی حفاظت کرتا اور ان پر مہربان ہوتا ہے۔ ایک قبیلے کا ٹوٹم دوسرے قبیلے کے لئے خطرناک سمجھا جاتا تھا مگر اپنے قبیلے کے لئے وہ بے ضرر سمجھا جاتا تھا اور اگر ٹوٹم کا حامل جانور اپنے قبیلے کے کسی شخص کو نقصان پہنچاتا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ مذکورہ شخص کی کسی بے ادبی کے باعث ٹوٹم اس سے ناراض ہے۔ قبیلے والوں پر بھی فرض تھا کہ وہ اپنے ٹوٹم کی جان کی حفاظت کریں اور احتراماً اس کا گوشت کھانے سے پرہیز کریں۔ ایک ٹوٹم سے تعلق رکھنے والے افراد کا بھی آپس میں گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہوتا جس کے تحت کچھ سماجی پابندیاں بھی عائد تھیں جس کی پاسداری سب پر لازم سمجھی جاتی تھی۔ دورِ حاضر کے کئی محقّقین بیشتر مذہبی پابندیوں کو ٹوٹم پرستی کی ہی باقیات قرار دیتے ہیں۔

حیوان پرستی یا جانوروں کی پرستش بھی مذہب کی ابتدا کا ایک محرک سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی قبیلوں میں بعض جانور محترم اور مقدّس تصّور کیے جاتے تھے اور لائقِ پرستش سمجھے جاتے تھے۔ مغربی یورپ کے مدفن غاروں سے انسانی ڈھانچوں کے ساتھ ریچھ اور دوسرے جانوروں کے مجسمّے ملے ہیں۔ زراعت کی ابتدا بھی جانوروں کی اہمیت کا سبّب بنی۔ خصوصاً بیل کے تصّور کو زمین کی زرخیزی اور فصلوں کی پیداوار سے منسلک کیا گیا۔ قدیم یونان کے جزیرہ کریٹ میں ڈایونیسس دیوتا کے تہوار کے موقع پر احتراماً زندہ بیل کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھایا جاتا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق دیوتا کو اس کے دشمنوں نے اس وقت قتل کیا تھا جب وہ بیل کے روپ میں تھا۔ قدیم مصر میں انسان اور حیوان کے مرکب دیوتاؤں کا بھی تصّور تھا جبکہ ہندوستان میں یہ تصّور آج بھی موجود ہے کہ ہندوؤں کے دیوتا گنیش ہاتھی کا سر اور انسان کا جسم رکھتے ہیں۔

برطانیہ کے ماہرِ سماجیات ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spenser، ۱۸۲۰ء۔ ۱۹۰۳ء) انسان کے اپنے آباؤ اجداد اور ان سے منسلک اساطیری قصّے کہانیوں (Mythology) کو مذہب کی ابتدا قرار دآباؤ اجداد اور ان سے منسلک اساطیری قصّے کہانیوں (Mythology) کو مذہب کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ اسپنسر کا ماننا ہے کہ ابتدائی انسان اس ذہنی شعور سے بہرہ مند نہیں تھا جس کے تحت وہ کسی خدا یا دیوی دیوتاؤں کو ظاہری

صورت دے کر ان کی پرستش کر سکتا۔ اس کے سامنے صرف اپنے اجداد کی بہادری کے کارنامے تھے جنھیں وہ سنتا رہتا تھا اور ان پر فخر و مباہات کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ان اجداد کی شخصیتوں کو بھول گیا مگر اُن سے منسوب قصّوں اور کہانیوں کو دیوی دیوتاؤں سے منسلک کرکے انہیں قابلِ پرستش سمجھنے لگا۔ اگر کسی کے آباؤاجداد کے کارنامے اس کے قبیلے تک محدود رہے تو وہ قبیلے کا دیوتا کہلایا اور اگر اس کے کارنامے پوری قوم میں شہرت پاگئے تو اسے قومی دیوتا کا درجہ مل گیا۔ دنیا کی تمام قدیم قوموں میں ایسی ہستیاں ملتی ہیں جن سے مافوق الفطرت کارنامے منسلک کرکے انہیں دیوی دیوتاؤں کا درجہ دیا گیا۔ یونان میں جہاں دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے یہ تصّور ملتا تھا کہ سارے دیوی دیوتا، بشمول زیوس و اپولو جیسے بڑے دیوتا، ابتدا میں ان کے اجداد تھے جو مرنے کے بعد اپنی نیکی کی بدولت دیوی دیوتا بن کر کوہِ اولمپس پر رہنے لگے۔ اسی طرح وادی سندھ میں بسنے والے آریاؤں کا سب سے بڑا دیوتا اندر بھی قبیلے کا ایک بہادر سورما تھا جو بعد میں جنگ کا دیوتا کہلایا۔ علاوہ ازیں ہندو مذہب کے دیوتا رام چندر اور کرشن بھگوان بھی وادی گنگا جمنا کے سورما تھے، جنھیں دیوتا مان لیا گیا۔

مذہبیات کے ماہرین کا بھی ماننا ہے کہ انسان فطرتاً قصّے کہانیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ ان کے ذریعے اُن چیزوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے جو عقل سے بعید دکھائی دیتی ہیں۔ ان قصّے کہانیوں میں ہمیشہ ایک ایسے تصوراتی کردار کو بھی بیان کیا جاتا ہے جو بہادر، نڈر اور نیک فطرت ہوتا ہے۔ عام زبان میں اسے ہیرو کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان اس کردار (ہیرو) میں تمام مثبت خصوصیات دیکھنا چاہتا ہے اور ان ہی خصوصیات کی بناء پر وہ اُسے لائقِ تعظیم جانتا ہے۔ ہم تاریخ کے حوالے سے دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کی تمام قدیم قوموں میں ایسے تصوراتی افراد نمایاں رہے جنھیں عظمت کی بلندیوں پر بٹھا کر ماورائی درجہ دیا گیا۔ نہ صرف قدیم قوموں کا یہ مزاج رہا ہے بلکہ آج بھی انسان ہیر وازم کے اثرات سے بچا ہوا نہیں ہے۔

اجداد پرستی کا ایک رخ مردہ پرستی کے تصور میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشرے میں جب تک تدفین کا رواج قائم نہیں ہوا تھا اور لوگ اپنے مُردوں کو خود سے دور نہیں کرتے تھے تو ان سے کسی قسم کا کوئی ڈر اور خوف بھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا لیکن جب مُردہ انسانی جسم گلنے سڑنے لگے تو ان کو ٹھکانے لگانے کی بابت سوچا جانے لگا۔ مُردوں کو کھلی جگہ چھوڑ دینے میں جنگلی جانوروں سے انہیں

نقصان پہنچنے کا خطرہ درپیش تھا لہٰذا انہیں غاروں میں پتھروں سے ڈھک کر رکھا جانے لگا جو آگے جا کر تدفین کے طریقے میں بدل گیا۔ ۱۹۵۷ء میں کوہِ زگروس (کردستان عراق) میں موجود شانیدر (Shanidar) کے غاروں سے ۴۵ سے ۶۵ ہزار سال پرانے نینڈر تھلز نسل کے نو انسانی ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں جنھیں ان غاروں میں ساز وسامان کے ساتھ باقاعدہ دفن کیا گیا تھا۔

ماہرِ بشریات ایڈورڈ ٹیلر کا ماننا ہے کہ تدفین کی بدولت مُردوں سے دوری نے زندہ انسانوں میں ان سے خوف کی بنیاد ڈالی اور مُردوں کا ناراض ہو کر چلے جانے اور بھوت پریت کی شکل میں واپس آکر قریبی عزیزوں کو ساتھ لے جانے کے تصورات باآسانی قائم ہوگئے۔ ان مشکلات سے بچنے کے لیے ذہنِ انسانی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر مُردوں کی خوشنودی اور پسند کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو وہ بدلے میں انہیں فائدہ پہنچانے کا سبّب بنیں گے، جبکہ ان کی ناراضگی تباہی اور بربادی کا باعث بن جائے گی۔ لہٰذا مُردوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے آگے من پسند غذا اور قیمتی تحفے تحائف نذر کیے جانے لگے اور مناجات و بھجن گا کر ان کی منت سماجت کی جانے لگی۔ یوں یہ عمل مذہب کی ابتدا کا باعث بن گیا۔

حجری دور کے غاروں میں مدفون نینڈر تھال نسل کے مُردوں کے ساتھ کیے جانے والے خصوصی سلوک کے شواہد ملتے ہیں۔ ان غاروں میں مُردوں کے سر کے نیچے چونے کے پتھر سے بنے تکیے پائے گئے ہیں۔ جنھیں انسانی ہاتھوں نے خاصی جانفشانی کے ساتھ رگڑ رگڑ کر ملائم بنایا تھا۔ اطراف میں پھولوں کے زیرہ کی موجودگی بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ محبت کے اظہار کے طور پر صاحبِ قبر پر پھول بھی نچھاور کیے گئے تھے۔ بعض قبروں میں آگ کی موجودگی کے آثار بھی ملے ہیں۔ اٹلی کے گری ملدی کے غار میں مدفون ڈھانچوں کی ہڈیوں پر لال رنگ کا خاص سفوف ملا ہے۔ غالباً وہ لوگ مردوں کی دوبارہ زندگی کو یقینی سمجھتے تھے اس لئے لال رنگ خون کی نمائندگی اور زندگی کی علامت کے طور پر چھڑکتے تھے۔ چین میں آج بھی مُردہ پرستی کی سب سے زیادہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ جہاں مردہ عزیزوں کی قبر کی ہر سال پابندی سے درستگی کی جاتی اور نذرانے کے طور پر کھانے پینے کے علاوہ قیمتی لباس اور سرد موسم میں کمبلوں کے تحفے تک قبر پر چڑھائے جاتے تھے۔

مُردوں سے متعلق یہ عقیدہ بھی پایا جاتا تھا کہ بہادر مُردوں خصوصاً آباؤاجداد کی ہڈیوں کا ہار پہننا نہ صرف بد روحوں اور بلاؤں سے بچنے کا باعث ہوتا ہے بلکہ حالتِ جنگ میں انہیں ساتھ رکھنا دشمن پر فتح وکامرانی کی ضمانت بھی بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں قدیم آسٹریلیائی باشندوں میں بہادر مُردوں کی کھوپڑی میں پانی یا مشروب اس عقیدے کے ساتھ پینے کا تصّور موجود تھا کہ اس کی طاقت پینے والے کے جسم میں حلول کر جائے گی۔ اسی طرح اپنے مردہ عزیزوں کا گوشت کھانے کو بھی خاندانی اتحاد کو تقویت بخشنے کا باعث اور ماضی کو حال سے منسلک کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ وینڈبلٹ یونیورسٹی کی ڈاکٹر بیتھ کانکلن نے جنوبی امریکہ کی ریاست گیانا کے واری قبیلے کے لوگوں کے بارے میں تحقیق کی کہ پچاس سال پہلے تک یہاں کے لوگوں میں اپنے مردہ رشتے داروں کا گوشت اس عقیدے کے ساتھ کھانے کا رواج تھا کہ مرنے والے عزیز کا گوشت کھالینے سے اس کی روح خاندان کے کسی فرد میں سرایت کر جاتی ہے۔

ابتدائے مذہب سے متعلّق دنیا میں موجود بیشمار نظریات میں ایک نظریہ خدائے واحد کی موجودگی کا بھی پایا جاتا ہے۔ جو دعویٰ کرتا ہے کہ مناظرِ فطرت اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش سے قبل، انسان اوّل دن سے وحدانیت کے تصّور سے آشنا تھا اور ایک خدا کی عبادت کرتا تھا۔ اس نظریئے کے مطابق کائنات میں موجود ہر شئے کا خالق خدا ہے۔ جو نہ جسم رکھتا ہے اور نہ جسمانی حاجات اسے درپیش ہوتی ہیں۔ اس نے اوّل دن سے انسان کو اس صورت میں خلق کیا جس میں وہ آج بھی موجود ہے اور اس صورت کے ساتھ ساتھ اسے مذہب کی فکر بھی عطا کی۔ جس کے تحت دنیا میں بھیجے جانے والے پہلے انسان آدم کو بشریت کے ساتھ ساتھ نبوت کے منصب پر بھی فائز کیا تاکہ وہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا سکیں۔ نبوت کا یہ سلسلہ آدمؑ کے بعد بھی جاری رہا اور جب بھی انسانوں نے خدا کی راہ چھوڑ کر شرک یعنی غیرِ خدا کی پرستش کی راہ اختیار کی، انبیاء وحدانیت کی تبلیغ کے لئے آتے رہے۔ گویا انسان کو اوّل دن سے خدا کی معرفت اور اس کی محبت کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

موجودہ دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام توحید یعنی خدائے واحد پر یقین رکھنے والے مذاہب شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان تینوں مذاہب میں موجود خدا کے تصور کو پیش

کریں یہ بھی بیان کرتے چلیں کہ ان تینوں مذاہب سے قبل بھی خدائے واحد کی عبادت کا تصور تاریخ انسانی میں ملتا ہے۔

پانچ ہزار قبل مسیح ایران کے صوبے آذر بائیجان میں پیدا ہونے والے جناب زرتشت نے مناظرِ فطرت پر مشتمل بے شمار دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرنے والی قوم کو ایک معبودِ حقیقی کی طرف راغب کیا۔ جسے وہ "اہورا مزدا" یعنی عقل کل کہہ کر پکارتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تیس سال کی عمر میں موسمِ بہار کے تہوار کے موقع پر جناب زرتشت دریا پر پانی لانے کی غرض سے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک چمکتی ہوئی نورانی پیکر ووہومناہ (نیک مقصد) سے ہوئی۔ جناب زرتشت کو ان کے نیک ارادوں کا یقین دلانے کے بعد وہ انہیں عظیم ترین اہورامزدا کے پاس لے گئی۔ اپنی بقیہ زندگی میں جناب زرتشت ووومناہ سے ملتے رہے۔ کبھی وہ اسے براہِ راست دیکھتے تو کبھی اس کے الفاظ سنتے اور کبھی صرف اس کی موجودگی کا احساس کرتے تھے۔

جناب زرتشت کے نزدیک اہورامزدا ایک لافانی اور غیر تخلیق خدا تھا۔ جو ہر چیز کا خالق تھا۔ جناب زرتشت کے بارے میں تاریخ کو زیادہ معلومات حاصل نہیں البتہ زرتشتی عقیدے کے مطابق پیغمبر زرتشت کی اپنے خدا کی شان میں کہی گئی سترہ حمد و مناجات پر مشتمل مجموعہ " گاتھا" آج بھی موجود ہے جس میں وہ اہورامزدا کی صفات یوں بیان کرتے ہیں:

*"O Ahura Mazda,The Lord of life and wisdom, ruling over the world through his wisdom and knowledge.*

*O Mazda! Teach me the best words and noblest deeds, so that through this teaching i may worship thee with a clear mind and a pure heart through your power*

*O Ahura, Tell me! Who is the creater of light and darkness? Who has created the dawn, the day and the night, teaching the wise man to fulfill his daily duties properly? O Mazda recognises thee as Lord Supreme(11)*

اے اہورامزدا! زندگی و حکمت کے رب، جو اپنے علم و حکمت کے ذریعے جہاں پر حکومت کرتا ہے۔ اے مزدا! مجھے سکھا، بہترین الفاظ اور پاکیزہ خواہشات کہ جس کے ذریعے میں عقل اور قلبِ سلیم سے تیری عبادت کروں۔ اے اہورا! مجھے بتاؤ کہ کون ہے جس نے روشنی اور

اندھیرے کو پیدا کیا؟ کس نے صبح صادق کو جلا بخشی اور دن ورات بنائے؟ کس نے دانا و نیکوکار کو اپنے فرائض کی انجام دہی کرنی کی توفیق بخشی۔ اے مزدا! تم نے، جو ربِ عظیم ہے۔

۱۳۸۰ قبل مسیح مصرِ قدیم کے فرمانروا امینوفس چہارم المعروف اخناطون (Akhnaton) کے ساتھ بھی خدائے واحد کی عبادت کا تصور منسوب ہے جس نے مصر میں بت پرستی کی پرانی روایات کے خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک خالق کی عبادت رائج کی جسے وہ "عاطون" یعنی زندگی دینے والے کے نام سے پکارتا تھا۔ انیسویں صدی سے قبل اخناطون اور اس کے مذہب کے متعلق دنیا کو کچھ خاص معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ۱۸۴۰ء میں ایک برطانوی ماہر مصریات جان ولکنسن Sir John G. Wilkinson (۱۷۹۷ء۔۱۸۷۵ء) نے تل الامارنہ کے مقام سے اخناطون کا مقبرہ دریافت کیا جہاں کچھ ایسی رنگین تصاویر موجود تھیں جن میں سورج کو کرنوں کے ساتھ روشنی بکھیرتے دیکھا یا گیا تھا۔ اس مقبرے میں خاص بات یہ تھی کہ وہاں مصریوں کے بے شمار دیوی دیوتاؤں میں سے کسی ایک کا بھی بت یا کوئی نام و نشان موجود نہیں تھا۔ جرمنی کے ماہرِ آثار رچرڈ لیپسیوس Richard Lepsius (۱۸۱۰ء۔۱۸۸۴ء) نے ان پر تحقیق کا کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ اخناطون، جس خدا کی عبادت کرتا تھا وہ اسے عاطون یعنی خالق اور زندگی دینے والا گردانتا تھا۔ اس خدا کی کوئی شبیہہ یا بت نہیں بنایا جاتا تھا اور سورج کو اس کا مظہر مانا جاتا تھا جس کی نعمتیں ہر ایک پر بلاامتیاز نازل ہوتی ہیں۔

تل الامارنہ سے حاصل ہونے والی تختیوں کے مطابق اخناطون کے مذہبی عقائد میں بت پرستی کی شدید ممانعت، اعمال کی انجام دہی درست طریقے سے کی جانے کی تلقین اور پروہتوں کی جانب سے دیئے گئے احکامات خصوصاً، حیات بعدالموت کے قدیم مصری تصور کی نفی اور اسے لغویات قرار دینا شامل تھا۔

اخناطون نے اپنے سات سالہ مختصر دورِ حکومت میں اپنے خدائے واحد عاطون کے تصور کو ملک کے دور دراز علاقوں تک پھیلانے کی سعی کی، لیکن اس کی موت کے بعد مصر کے پروہتوں نے اس کو قومی مجرم قرار دے کر اس کے مذہب کو ختم کر دیا اور اس سے اور اس کے خدا سے متعلق ہر نشان کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی تاہم دریائے نیل کے زیریں کنارے کے ساتھ اخناطون کے اپنے خدا کے نام پر تعمیر کرائے گئے نئے دارالحکومت اخی تین (عاطون کا اُفق) جسے اب تل الامرنا کے نام سے جانا جاتا ہے، کی چٹانوں میں خدائے واحد کی شان میں

درج اس کی حمد ملی ہے۔ ذیل میں اس حمد کا انگریزی ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو امریکی ماہرِ مصریات جیمز ہنری بریسٹڈ James Henry Breasted (۱۸۶۵ء۔۱۹۳۵ء) کی کاوش ہے

*How many are your deeds ,*
*Though hidden from sight.*
*O sole God without equal*
*You made the Earth, as you desired, you alone,*
*With people, cattle and all creatures,*
*With everything upon Earth that walk on legs,*
*And all that is on high and flies with its wings (12)".*

کتنی تمہاری نیکیاں ہیں جو کہ نظروں سے پوشیدہ ہیں اے خدائے یکتا! جس کا کوئی ثانی نہیں۔
تم نے ہی تنہا زمین بنائی، جیسا تم نے چاہا۔
انسان بنائے، چوپائے اور ساری مخلوقات، اور وہ سب جو اس زمین پر پیروں پر چلتے ہیں،
اور وہ سب بھی جو فضاؤں میں اپنے پروں کے ساتھ اڑتے ہیں۔

علمی و مذہبی حلقوں میں اخناطون کے مذہب کے متعلق بہت سے قیاسات پیش کیے جاتے ہیں۔ جرمنی کے ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ، جو خود یہودی مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اس بات کے دعویدار تھے کہ حضرت موسیٰؑ نے مصر میں جس مذہب کو متعارف کرایا، وہ کوئی نیا مذہب نہیں تھا بلکہ اخناطون کا ہی مذہب تھا جسے اس کے مرنے کے بعد مصریوں نے ترک کر دیا تھا۔ فرائیڈ اپنی معروف کتاب Moses And Monotheism میں لکھتے ہیں:

*'If Moses was an Egyptian and if he transmitted to the jews his own religion then it was that of Ikhnaton, the Aton religion (13) ".*

اگر موسیٰ مصری تھے اور وہ بنی اسرائیل کو ان کے مذہب پر واپس لانا چاہتے تھے تو وہ اخناطون کا دینِ عاطون تھا۔

سگمنڈ فرائیڈ کے مطابق حضرت موسیٰؑ کا تعلّق مصر سے تھا جو ان کے نام موسس (Moses) سے ظاہر ہوتا ہے۔ مصری زبان میں اس کے معنیٰ "پیدا ہوا" کے ہیں۔ مصر میں اس جیسے بہت سے نام ملتے ہیں جیسے

توتھ موس، حاموس اور عامون موس وغیرہ۔ لہٰذا اگر موسیٰؑ مصری تھے تو جو مذہب انہوں نے قومِ یہود کو عطا کیا وہ بھی مصری تھا تو لازماً وہ اخناطون کا ''دینِ عاطون '' تھا۔ عامون کے پروہتوں نے عاطون کے مذہب کا نام و نشان مٹا کر مشکل پیدا کر دی ہے، جبکہ یہودیت کو ہم آج اس کی آخری اور قطعی شکل میں جانتے ہیں جسے موجودہ صورت خروج کے آٹھ سو برس بعد عطا کی گئی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جس سے یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا کہ موسیٰؑ کا دین عاطون کا دین تھا۔ (14)

اسرائیلی علماء کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اخناطون اور موسیٰ علیہ السلام کو ایک ہی شخصیت قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ دعویٰ ان کے درمیان پائے جانے والی قدرِ مشترک کی بنا پر کرتے ہیں کہ ان دونوں نے ہی بت پرستی سے بغاوت کی اور خدائے واحد کے دین کو پیش کیا۔ اس دعویٰ کو سند دینے کے لئے یہ بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ اخناطون کی ماں ملکہ توئی کا تعلّق بھی عبرانی نسل سے تھا جس سے موسیٰؑ بھی تعلق رکھتے تھے۔

دورِ حاضر کے برطانوی پروفیسر اور سائنسدان رابرٹ ونسٹن Robert winston (۱۹۴۰ء) اخناطون کے مذہب کو توحید پرست مذاہب کی صف میں نہیں رکھتے بلکہ وہ اس کے لئے Cathenotheism کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں یعنی ایسے خدا پر یقین رکھنے والا مذہب جو دوسرے خداؤں کے مقابلے میں بہتر اور برتر ہے۔ (15)

اگر ہم حقائق پر غور کریں تو یہ قیاس ہمیں خاصہ قویٰ معلوم ہوگا کہ اخناطون کا خدائے واحد (عاطون) دراصل وہی خدائے واحد ہے کہ جس کی تبلیغ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصریوں کے درمیان کی تھی کیونکہ عہد نامہ قدیم (بائبل) اور قرآن مجید کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے مصر میں وحدانیت کا آغاز حضرت یعقوب علیہ السلام نبی کے بیٹے اور پیغمبرِ خدا حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعے کیا گیا تھا۔ جو امینوفس چہارم المعروف اخناطون کے دورِ حکومت میں عزیزِ مصر کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں یہ واضح نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں جس خدائے واحد کا تصّور پیش کیا تھا اس سے قبل حضرت یوسف علیہ السلام مصریوں میں اس کی تبلیغ سرانجام دے چکے تھے اور ان کے پیروکاروں میں اخناطون اور اس کی ملکہ نفرتی بھی شامل تھے۔ گویا اخناطون کا خدائے واحد کا تصور دراصل پیغمبرِ خدا حضرت یوسف علیہ السلام کا دیا ہوا تصور تھا۔ جسے بادشاہِ وقت اخناطون کے حوالے سے یاد رکھا گیا۔

یہودیت، عیسائیت اور اسلام توحید کے حامی مذاہب مانے جاتے ہیں جو اس مشترک عقیدے کے ساتھ ساتھ اپنا سلسلہ بھی ایک ہی نبی، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتے ہیں۔ یہودیت ان تینوں میں سب سے قدیم ہے۔ جس کی تاریخ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے جنھوں نے اٹھارہ سو قبلِ مسیح میں قدیم عراق کے شہر اُر میں بیشمار دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے مقابلے میں ایک خدا کی عبادت کا تصّور پیش کیا۔ خدائے واحد پر ایمان کے سلسلے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آنے والے انبیاء نے بھی قائم رکھا جن میں حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ شامل ہیں، لیکن یہودی تاریخ میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اہم مقام حاصل ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کی نسبت سے یہودی قوم بنی اسرائیل کہلائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، جنھوں نے بنی اسرائیل کو طویل مدّت کی غلامی کے بعد فرعونِ مصر کی قید سے رہائی دلوا کر خدا کے وعدے کے مطابق ان کے وطن، ارضِ موعودہ کی راہ دکھائی اور انہیں توریت کی شکل میں احکامِ الٰہی عطا کئے۔

یہودی خدا کو یہواہ(Yhwh) کہہ کر پکارتے ہیں۔ جس کی بابت ان کا ماننا ہے کہ خداوند نے اپنے نام کو پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا نام لینا جائز نہیں ہے اور اسے اس کے الوہی نام (یہواہ) سے ہی پکارا جانا چاہیے۔ عہد نامہ قدیم، باب خروج میں خدا کی جانب سے بنی اسرائیل کے لئے دیئے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دس احکامات میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ:

''خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔'' (16)

تاہم توریت میں خدا کے لئے یہواہ کے علاوہ الوہم(Elohim) اور الشّدائی(EL-Shyddai) کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ تاریخ دانوں اور علمائے یہود کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خدا کو کبھی ''الوہم'' اور کبھی ''الشدائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ جن کے معنی ''آقا اور قادرِ مطلق'' کے ہیں۔

یہودی عقائد کے مطابق خدا پوری کائنات کا واحد خالق و مالک ہے جو جسم و جسمانیت سے مبرّا اور نہ دکھائی دینے والا ہے۔ اس کو دیکھنا انسانی آنکھ کے بس میں نہیں مگر اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ یہودیوں کی مقدّس کتاب توریت کی کتابِ یسعیاہ میں خدا کا فرمان ہے کہ ربّ الافواج یوں فرماتا ہے کہ

"میں ہی اوّل اور میں ہی آخر ہوں اور میرے سوا کوئی خدا نہیں۔" (17)

یہودیت میں بت پرستی کی شدید مخالفت کی جاتی ہے اور شرک کو گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ کتاب خروج (عہد نامہ قدیم) میں خدا کا فرمان ہے کہ

"میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں اور ہزاروں پر جو مجھ سے محبّت رکھتے ہیں اور میرے حکموں کو مانتے ہیں رحم کرتا ہوں۔" (18)

یہودی خدائے واحد پر یقین کے عقیدے کی پختگی کے لئے روزانہ صبح شام کی جانے والی عبادت میں مندرجہ ذیل آیت کو دہراتے ہیں جسے شیما (Schema) کہا جاتا ہے کہ

"سنو! اے اسرائیل ہمارا آقا ہمارا خدا ہے جو واحد ہے۔"

عہد نامہ قدیم کے مطابق خدا نے چھ دن میں کائنات و انسان کی خلقت مکمل کی اور ساتویں دن آرام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں میں ہفتے کے چھ دن کام کاج میں مصروف رہنے کے بعد ساتویں دن آرام کیا جاتا تھا۔ عہد نامہ قدیم ہمیں بتاتا ہے کہ:

"سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا۔ اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا۔ اور خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدّس ٹھہرایا کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے جسے اس نے پیدا کیا اور بنایا فارغ ہوا۔" (19)

عیسائی مذہب ابتدا میں ایک یہودی فرقے کے طور پر ظاہر ہوا تھا۔ سنہ ۸۰ء میں حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں کو یہودی عبادت خانے سے نکال دیئے جانے کے بعد اس نے ایک الگ مذہب کی شکل اختیار کرلی اور آج دنیا میں سب سے زیادہ پیروکار اسی مذہب کے پائے جاتے ہیں۔ عیسائیوں میں خلقتِ کائنات و بشر سے متعلق وہی عقائد پائے جاتے ہیں جو یہودیوں میں رائج ہیں البتہ عیسائی خدا کی الوہیت میں حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کو بھی شامل کرتے ہیں اور نظریہ تثلیث و تجسیم کے قائل ہیں۔

تثلیث باپ، بیٹا اور روح القدس سے مرکب ہے۔ جس کے مطابق خدا ایک ہی وقت میں ذاتِ واحد کی صفت بھی رکھتا ہے اور تین (باپ، بیٹا اور روح القدس) میں بھی منقسم ہے۔ باپ سے مراد خدا کی ذات ہے جبکہ خدا کی صفت کلام کو بیٹے کا درجہ حاصل ہے جو یسوع مسیح کی شکل میں ظاہر ہوا اور روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفتِ محبت ہے جس کی بدولت باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے۔ تجسیم سے مراد، خدا کی صفت کلام (بیٹا) انسانوں کی فلاح کی خاطر یسوع مسیح کے انسانی پیکر میں حلول کر گئی اور یسوع مسیح کے سولی پر چڑھ جانے کے وقت تک موجود رہی۔ انجیل یوحنّا میں اسے یوں بیان کیا گیا کہ:

"ابتدا میں کلام تھا، اور کلام خدا کے ساتھ تھا، اور کلام خدا تھا، یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔ وہ دنیا میں تھا اور دنیا اس کے وسیلے سے پیدا ہوئی اور دنیا نے اسے نہ پہچانا۔ وہ نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے نہ انسان کے ارادے سے بلکہ خدا سے پیدا ہوئے۔ اور کلام مجسّم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔ کیونکہ اس کی معموری میں ہم سب نے پایا یعنی فضل پر فضل۔ اس لئے کہ شریعت تو موسیٰ علیہ السلام کی معرفت دی گئی مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔ خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا۔" (20)

توحید کے داعی مذاہب میں اسلام سب سے کم عمر مذہب مانا جاتا ہے۔ جس کی ابتدا ساتویں صدی عیسوی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں عرب میں پیدا ہونے

والے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں ہوئی جبکہ اسلام کے مطابق یہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ خدا، جسے اسلام میں اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، کی جانب سے بھیجے جانے والے ادیان کے سلسلے کا آخری پیغام ہے جو حضرت محمد ﷺ کے ذریعے پہنچایا گیا۔ ان کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ ہی کوئی اور شریعت۔ یہی دین قیامت تک قائم رہے گا۔ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی آخری آسمانی کتاب قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنا پسندیدہ دین قرار دیا ہے۔ جس کی تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء نے کی۔ قرآن حکیم میں اللہ کا ارشاد ہے کہ

"..... تمہارے لئے اس نے وہی دین مقرّر فرمایا جس کے متعلق نوح علیہ السلام کو ہدایت کی تھی اور اے رسول ﷺ اور وہ جو ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی اور اسی کا ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔" (21)

اسلام کے عقائد میں پہلا اور بنیادی عقیدہ توحید کا تصور ہے۔ اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور شرک سے بیزاری کا اظہار اسلام کے پہلے رکن کلمہ شہادت، "لا الٰہ الا اللہ"، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، کی ادائیگی سے کیا جاتا ہے۔ جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ کا فرمان ہے کہ

" ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ۔" (22)

ترجمہ: "خدا تمہارا پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (وہی) ہر چیز کا پیدا کرنے والا (ہے) تو اسی کی عبادت کرو۔ اور وہ ہر چیز کا نگراں ہے۔"

خلقتِ کائنات کے حوالے سے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات اور اس میں موجود تمام موجودات خواہ وہ نباتات ہوں حیوانات ہوں یا اشرف المخلوقات سب کا خالق اللہ ہے۔ قرآن الحکیم اللہ کی خلقت کی تعریف و توصیف یوں بیان کرتا ہے کہ:

"سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ O لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ O هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ O هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ

مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌO لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُO يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔" (23)

ترجمہ: "جو مخلوق آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ اور وہ غالب (اور) حکمت والا ہے، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ (وہی) زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے سب پر) ظاہر اور (اپنی ذات سے) پوشیدہ ہے اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ جو چیز زمین میں داخل ہوتی اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی اور جو اس کی طرف چڑھتی ہے سب اس کو معلوم ہے۔ اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں، رات کو دن میں داخل کرتا اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے۔"

خلقتِ انسانی کے متعلق اسلام یہ بتاتا ہے کہ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے خلق کیا اور انہیں نبوت کے درجے پر فائز کیا گیا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

"وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍO فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ۔" (24)

ترجمہ: "اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی کو خمیر دی ہوئی مٹی سے جو سوکھ کر کھنکھن بولنے لگے پیدا کرنے والا ہوں تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑنا۔"

دینِ اسلام کی رو سے اللہ نے خلقتِ آدمؑ کے بعد بچی ہوئی مٹی سے حضرت آدمؑ کا جوڑ یعنی ان کی زوجہ حضرت حواؑ کو پیدا کیا تاکہ ان دونوں انسانوں کے ذریعے نسلِ انسانی پروان چڑھے۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا انداز یوں بیان کیا گیا ہے:

"یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِی خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِیرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُواْ اللّهَ الَّذِی تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیبًا۔" (25)

ترجمہ: "اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اول) اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کرکے روئے زمین پر) پھیلا دیئے۔ اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت بر آری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

توریت و انجیل کے برعکس قرآن حکیم نے خلقت کے موضوعات کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا ہے۔ توریت و انجیل خلقت کے حوالے سے یہ بتاتی ہیں کہ ابتدا میں کائنات بے آب و گیاہ ویرانہ تھی لیکن یہ کہیں بیان نہیں ہے کہ بے آب و گیاہ ویرانے کی خلقت کس نے اور کیسے کی؟ جبکہ القرآن الحکیم بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہے وہ کسی کام کے کرنے سے عاجز نہیں ہے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ:

"إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَیْئًا أَنْ یَقُولَ لَهُ كُنْ فَیَكُونُ۔" (26)

ترجمہ: "جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا تو فوراً ہو جاتی ہے۔"

انسان کی خلقت کے اغراض و مقاصد کا جواب بھی قرآن مجید میں واضح اور مدلّل طور پر ملتا ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِیَعْبُدُونِ۔" (27) ترجمہ: "ہم نے جن و انس کو فقط عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔"

قرآن حکیم کا یہ بیان اس بات کو آشکار کرتا ہے کہ انسان اوّل دن سے اپنے خالق کی پہچان کی اس فکر کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے جسے عام اصطلاح میں مذہب اور اسلام میں دین کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن یہ

دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے ہدایت کے واسطے نازل کیا گیا ہے۔ القرآن الحکیم میں بیان ہوا کہ:

" فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا... " (28) ترجمہ: "اپنا منہ دین کی طرف سیدھا ہو کر کر یہ وہ خدا کی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔"

*****

## حوالہ جات


1۔ مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات، (مادہ م ذ) فیروز سنز، لاہور، س ن، ص: ۱۲۲۳

*2-Encyclopedia of Religion And Religions by E. Royston Pike, Published by The World Publishing Company, New York, 1958.*

*3-Tylor E. B., Primitive Culture, Chapter, Animisim, Cambridge University press, 2010.*

*4- Hopfe,Lewis. M, Religions of The World, Prentice Hall 1979, pg 6 .*

*5-Ibid , pg 21.*

*6-Frazer James G., The Golden Bough, part 1, A Touchstone Book published by Simon & Schuster New york 1996, pg 36.*

*7-Ibid, pg 62.*

*8-Ibid, pg 69 .*

*9-Marx Karl, Mark Engels on Religion, Schocken Books New York 1964, pg 38.*

*10-Freud Sigmund, Totem And Taboo, Tr by A.A.Brill, Barnes & Noble Publishing, New york, 2005.*

*11-Gathas, The Holy Songs of Zarathushtra, Translated by Mobed Firoz Azargoshasb,Yashna 32 and 42.*

12۔Finegan Jack, Light From The Ancient Past, Princeton University Press U.S.A, 1946, pg 96.

13۔Freud Sigmund, Moses And Monotheism, Tr by Katherine Jones, Vintage Book, pg 41.

14۔Ibid pg 45.

15۔ ونسٹن رابرٹ، سٹوری آف گاڈ، (مترجم محمد یحییٰ خان)، ص نمبر ۶۶۔

16۔ عہد نامہ قدیم، کتابِ خروج، ۷: ۲۰، دس حکم۔

17۔ عہد نامہ قدیم، کتابِ یسعیاہ، ۶: ۴۴، خداوند ہی واحد خدا ہے۔

18۔ عہد نامہ قدیم، کتابِ خروج، ۳: ۲۰تا۶، دس حکم۔

19۔ عہد نامہ قدیم، کتابِ پیدائش، ۱: ۲، ۳۱: ۱تا ۳، تخلیق کا بیان۔

20۔ عہد نامہ جدید، انجیل یوحنّا، ۱، ۳، ۲، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۴، ۱۳، ۱۰، زندگی کا کلام۔

21۔ سورہ شوریٰ، آیت: ۱۳۔

22۔ سورہ انعام، آیت ۱۰۲۔

23۔ سورہ حدید، آیت ۱تا۶۔

24۔ سورہ حجر، آیت ۲۹، ۲۸۔

25۔ سورہ نساء، آیت ۱۔

26۔ سورہ یٰسین، آیت ۸۲۔

27۔ سورہ ذاریات، آیت ۵۶۔

28۔ سورہ روم، آیت ۳۰۔

# گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے اسباب پر اجمالی نظر

امل موسوی*
Afm.pk.2013@gmail.com

**کلیدی کلمات:** سنت الٰہی، ہلاکت، ہلاک شدہ اقوام، ظلم و فساد۔

## خلاصہ

معاشرے اور اقوام کی حیات اور ممات میں سب سے اہم چیز وہ اسباب ہیں جو اقوام کی زندگی اور ہلاکت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ موت ہر کسی کا مقدر ہے، تاہم معاشروں کی حیات و ممات کسی فرد کی موت کی طرح نہیں ہوتی، بلکہ معاشروں کی ہلاکت یعنی صفحہ ہستی سے مکمل طور پر مٹ جانے کی کچھ وجوہات اور عوامل ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ تمام معاشرے اور قومیں ہلاکت سے دوچار ہوئی ہیں، جنہوں نے استکبار و کفر سے کام لیا اور احکام الٰہی کی نافرمانی کی۔

ان اقوام کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان میں ظلم و فساد عام تھا۔ ظلم صرف دوسروں پر ہی نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اپنی ذات پر بھی ظلم کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ پر ظلم شرک ہے، جو اُن میں عام تھا۔ انبیاء کی مسلسل ہدایت کے باوجود انہوں نے کفر و شرک کیا۔ خدا پر ظلم ہی اجتماعی ظلم کی بنیاد ہے۔ موجودہ معاشروں کو ہلاکت سے بچانے کے لئے گذشتہ ہلاک شدہ اقوام کا مطالعہ کرنے اور ان سے عبرت لینے کی ضرورت ہے۔

*۔ایم۔ایس۔ سی (سوشیالوجی)؛ انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

اس بات پر تقریباً تمام دانشور متفق ہیں کہ اس دور میں انسانی معاشرہ مختلف مسائل کا شکار ہے اور ان میں سے بعض مسائل کی وجہ سے نسل انسانی خطرے سے دوچار ہے۔ جنگ وجدال، قتل و غارت، غربت وافلاس اور پھر جغرافیائی عوامل کی وجہ سے پیش آنے والے مسائل کچھ ایسے ہیں جن کے حل کے لیے مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ ان کوششوں کے علاوہ جن کا دائرہ کار زیادہ تر مادی اور معاشی ہے ان وجوہات کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جن سے معاشرہ تباہی وبربادی کی طرف جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے تاریخ کا مطالعہ اور گذشتہ اقوام کے حالات سے آگاہی بھی اہم ہے کیونکہ گذشتہ دور میں ہونے والے واقعات اور اقوام کے خصائص ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس بارے میں نہج البلاغہ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے: ''فَما اشد اعتدال الاحوال و اقرب اشتباہ الامثال ''یعنی '' حالات کتنے ملے ہوئے ہیں اور طور طریقے کتنے یکساں ہیں '' (1) ساتھ ہی نہج البلاغہ میں گذشتہ اقوام کے حالات سے عبرت لینے کی بھی نصیحت کی گئی ہے: ''و اعتبر بما مضی من الدنیا ما بقی منها فان بعضها یشبه بعضا '' یعنی " اور گزری ہوئی دنیا سے باقی دنیا کے بارے میں عبرت حاصل کرو۔ کیونکہ اس کا ہر دور دوسرے دور سے ملتا جلتا ہے'' (2)

یہ بات ثابت شدہ ہے کہ گذشتہ اقوام کی تاریخ کے مطالعہ سے معاشروں کی تباہی اور اس کے اسباب کے بارے میں بیش قیمت معلومات ملتی ہیں، لیکن ان میں سے بہت سے مطالعات اور تجزیے ایسے ہیں جن پر مکمل طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ (مثال کے طور پر تاریخی مادیت کا نظریہ یا ارتقا کا نظریہ جس پر مسلسل نقد و تنقید کی جارہی ہے) ایسی صورت میں قرآن مجید اور احادیث معصومینؑ سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے ایسے اسباب کی نشاندہی ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں مسلسل اور کثرت سے انسانوں کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ نہ صرف نظام کائنات اور فطری نظام کے بارے میں غور و فکر کرنے کو کہا گیا ہے، بلکہ انسانی معاشروں پر نافذ نظام کے بارے میں بھی تامل و تفکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کریم ہدایت اور علم کا ذریعہ ہے۔ بہت سے مسائل قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں، جن کی حقیقت اور ماہیت تک عقل انسانی پہنچنے سے قاصر ہے، تاکہ انسان تفکر و تدبر سے ان میں تامل کرے اور نہ صرف اپنی زندگی کو بامقصد بناسکے،

بلکہ اس کے ساتھ معاشرے کی بقا کا انتظام بھی کیا جاسکے۔ ان موارد و مسائل کے بارے میں معرفت و پہچان کا ایک طریقہ گذشتہ اقوام کے حالات بیان کرنا یا یوں کہیے تاریخی واقعات کا بیان ہے۔ جیسے قوم عاد و ثمود نیز الٰہی شخصیات جیسے حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور طاغوتی شخصیات جیسے فرعون اور نمرود کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے۔

## سابقہ اُمم کے واقعات بیان کرنے کی وجوہات

قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے اور اس میں گذشتہ اقوام کے حالات بیان کرنے کا مقصد بھی ہدایت کرنا ہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان تاریخی واقعات اور حقائق کو بیان کرنے کا ایک اور مقصد عبرت بھی ہے تاکہ حال میں رہنے والے لوگ اور معاشرے گذشتہ دور میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں جان سکیں کہ کہاں انہوں نے غلطی کی ہے اور کس روش اور عادت کو اپنانے کی وجہ سے یہ معاشرے صفحہ ہستی سے اس طرح مٹ گئے کہ آج ان کا نام و نشان تک نہیں رہا اور ہلاکت ان کا مقدر بنی۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

''لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى وَلَكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ''۔

یعنی: ''بیشک ان کے قصوں میں سمجھ داروں کے لئے عبرت ہے، یہ (قرآن) ایسا کلام نہیں جو گھڑ لیا جائے بلکہ (یہ تو) ان (آسمانی کتابوں) کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) ہیں اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ہدایت ہے اور رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایمان لے آئے۔'' (3)

اس کے علاوہ قرآن میں تاریخی واقعات کو اس لئے بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگ قوانین الٰہی یعنی سنت الٰہی سے آشنائی حاصل کریں۔ سورۂ حج کی آیت 46 میں ارشاد ہوتا ہے:

''أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ''۔

یعنی: ''تو کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی کہ (شاید ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ سمجھ سکتے یا کان (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ (حق کی بات) سن سکتے، تو حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

جیسا کہ معلوم ہے انسانی زندگی کے دو بُعد (aspects) ہیں ایک انفرادی ہے اور دوسرا اجتماعی۔ اجتماع میں رہنے سے اس کے اجتماعی بعد (aspects) کی تشکیل ہوتی ہے اور اس طرح اجتماع یعنی معاشرہ انسانی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں انفرادی احکامات دینے کے ساتھ ساتھ اجتماع کے بارے میں بھی احکامات دیے گئے ہیں۔ الٰہی معاشرے کی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں اور گزرے ہوئے معاشروں کے حالات و واقعات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی ہلاکت کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے تا کہ زمان حال کے لوگ سنن الٰہی (قوانین الٰہی) جو انسانی معاشروں میں لاگو ہوتے ہیں کے بارے میں جان سکیں اور ان سے تخلف نہ کریں۔

## سنت الٰہی کیا ہے؟

''قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ''۔

یعنی: ''تم سے پہلے (گذشتہ امتوں کے لئے قانونِ قدرت کے) بہت سے ضابطے گزر چکے ہیں سو تم زمین میں چلا پھرا کرو اور دیکھا کرو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔'' (4)

لغت کی رو سے سنت وہ راستہ ہے جو تمام زمانوں میں یکساں طور پر طے کیا جاتا ہے۔ (5) سنت الٰہی وہ قوانین ہیں جن کی بنیادوں پر انسانی معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے اور نظام زندگی چلتا ہے، جیسے مادی دنیا، بلکہ پوری کائنات میں فطری قوانین ہیں اور انہی اصولوں کے مطابق دنیا میں نظم وانضباط پائی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو نظم و ترتیب بھی نہ ہو۔ اس طرح یہ تنظیم تکوینی (جبری) ہے۔ معاشرہ اپنی حیات کے لیے کچھ اصول و قوانین کا محتاج ہے۔ جیسے ہی انسان نے اس ضرورت کو درک کیا تو قوانین بنائے تا کہ معاشرہ قائم رہ سکے نیز ان قوانین سے انحراف کرنے والوں کے لیے سزائیں مقرر کی گئیں تا کہ معاشرے میں نظم وضبط قائم رہے۔ یہ تو ہیں انسان کے بنائے ہوئے قوانین جن میں تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی معاشرے پر فطری قوانین کا اطلاق ہوتا ہے، جن کو سنت الٰہی یا قانون الٰہی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ معاشروں میں ہونے والی تبدیلیاں اور تاریخی تحولات اتفاقی نہیں ہیں، بلکہ زندگی اور موت، ترقی اور انحطاط یہ سب کے سب ایک مشخص و معین سلسلہ قوانین کے تحت ہوتے ہیں جن کو سنت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (6)

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر عذاب الٰہی کا ذکر ملتا ہے نیز ان ہلاک شدہ اقوام کا بھی ذکر ہے جنہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور ان پر عذاب نازل کیا گیا۔ خطاکار قوم کو سزا دینا یا پھر ان کے گناہ کی نسبت سے عذاب سے دوچار کرنے کو سنت اولین کا نام دیا گیا ہے:

''قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَنتَهُوا يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ''۔

یعنی: ''آپ کفر کرنے والوں سے فرمادیں: اگر وہ (اپنے کافرانہ افعال سے) باز آجائیں تو ان کے وہ (گناہ) بخش دیئے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اگر وہ پھر وہی کچھ کریں گے تو یقیناً اگلوں (کے عذاب در عذاب) کا طریقہ گزر چکا ہے (ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا)'' (7)

## ہلاکت کا مفہوم

ہلاکت کے لفظی معنیٰ مرنا اور ختم ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ ایک فرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا اطلاق قوم اور معاشرے پر بھی ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قوموں اور معاشروں کی پستی کے لیے زوال کا لفظ استعمال ہوتا ہے تاہم زوال بمعنیٰ ہلاکت نہیں ہے۔ اس طرح زوال ہلاکت کا ہم پہلو نہیں ہے ہر چند زوال ہلاکت کی وجوہات میں سے ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یعنی ایک قوم تدریجاً پستی کی طرف جاتے ہوئے زوال پذیر ہو کر ہلاک ہو سکتی ہے۔ ہلاکت سے مراد ایک معاشرہ، قوم یا تہذیب کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا ہے۔ ہلاکت کا یہ عمل زوال کی صورت میں تدریجاً بھی ہو سکتا ہے اور اچانک بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں قوم عاد، ثمود وغیرہ کے بارے میں بتایا گیا جہاں زندگی اچانک رک گئی تھی۔

موت اور زندگی کا قانون صرف انسانوں سے ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس میں انسانی معاشرے اور تہذیبیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ تاریخ پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کچھ اقوام اور معاشرے پہلے موجود تھے، لیکن اب ان کے آثار ہی باقی ہیں جو ان کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔

اس طرح زندگی اور موت کا قانون صرف انفرادی زندگی پر ہی لاگو نہیں ہوتا، بلکہ یہ معاشروں پر بھی لاگو ہوتا ہے تاہم اس کی زندگی اور ہلاکت کی صورت معاشروں میں مختلف ہے۔ انسانی معاشروں کی ہلاکت عموماً حق و حقیقت کے راستے سے بھٹک جانے کی صورت میں ہوتی ہے جیسا کہ اس کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے:

"قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُواْ إِن يَنتَهُواْ يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ وَإِنْ يَعُودُواْ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ"۔

یعنی: "آپ کفر کرنے والوں سے فرما دیں: اگر وہ (اپنے کافرانہ اَفعال سے) باز آجائیں تو ان کے وہ (گناہ) بخش دیئے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور اگر وہ پھر وہی کچھ کریں گے تو یقیناً اگلوں (کے عذاب در عذاب) کا طریقہ گزر چکا ہے (ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا)" (8)

اس طرح معاشروں کی ہلاکت گناہوں کا رد عمل ہے۔ جس طرح بین الاقوامی قوانین کا نفاذ کیا گیا ہے اور ان قوانین سے انحراف کرنے والے ممالک کو رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے (ہر چند یہ قوانین صرف محروم اور غریب ممالک کے لیے ہیں) اسی طرح انسانی معاشروں کے لیے بھی فطری قوانین ہیں اور جزا و سزا کا نظام نافذ ہے جس کا اطلاق تمام معاشروں پر یکساں ہوتا ہے اور مسلسل الٰہی احکام کو پامال کرنے کی صورت میں معاشروں کو یہ سزا ہلاکت کی صورت میں ملتی ہے۔ ہلاکت منحرف معاشروں کی آخری سزا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَلَقَدْ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰٓ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ۔ فَلَوْلَآ إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُواْ وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ۔ فَلَمَّا نَسُواْ مَا ذُكِّرُواْ بِهِۦ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰٓ إِذَا فَرِحُواْ بِمَآ أُوتُوٓاْ أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُواْ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔"

یعنی: "اور بیشک ہم نے آپ سے پہلے بہت سی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے، پھر ہم نے ان کو (نافرمانی کے باعث) تنگ دستی اور تکلیف کے ذریعے پکڑ لیا تاکہ وہ (عجز و نیاز کے ساتھ) گڑگڑائیں۔ پھر جب ان تک ہمارا عذاب آ پہنچا تو انہوں نے عاجزی و زاری کیوں نہ کی؟ لیکن

(حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دل سخت ہو گئے تھے اور شیطان نے ان کے لئے وہ (گناہ) آراستہ کر دکھائے تھے جو وہ کیا کرتے تھے۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو فراموش کر دیا جو ان سے کی گئی تھی تو ہم نے (انہیں اپنے انجام تک پہنچانے کے لیے) ان پر ہر چیز (کی فراوانی) کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں (کی لذتوں اور راحتوں) سے خوب خوش ہو (کر مدہوش ہو) گئے جو انہیں دی گئی تھیں تو ہم نے اچانک انہیں (عذاب میں) پکڑ لیا تو اس وقت وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔ پس ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی، اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔" (9)

## ہلاک شدہ اقوام کے حالات

ہلاک شدہ اقوام کے حالات بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ماضی میں جو معاشرے تباہ ہوئے ہیں، وہ کس قسم کے معاشرے تھے۔ کیا ان کا شمار اس زمانے کے لحاظ سے پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ معاشروں میں ہوتا ہے یا نہیں وہ مہذب اور پیشرفتہ معاشرے تھے۔ یہاں پر بطور مثال صرف عاد و ثمود کے حالات مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔

تاریخ میں دو قبیلوں کا ذکر نام عاد سے کیا گیا ہے۔ ایک جسے قرآن نے عاد الاولیٰ سے تعبیر کیا اور دوسری وہ جو ولادت مسیح سے سات سو پہلے تھا۔ یہ احقاف یا یمن میں رہائش پذیر تھا۔ (10) عاد کے افراد بلند قامت اور متمدن تھے۔ آباد شہروں میں رہتے تھے اور ان کے ہاں باغات اور بڑے بڑے محل تھے، جسے قرآن مجید نے بڑے بڑے ستونوں سے تعبیر کی ہے: " إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ○ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ"۔ یعنی: (جو اہلِ) اِرم تھے (اور) بڑے بڑے ستونوں (کی طرح دراز قد اور اونچے محلات) والے تھے۔ جن کی مثل (دنیا کے) ملکوں میں (کوئی بھی) پیدا نہیں کیا گیا" (11) اس سے ان کی ترقی اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی طرف حضرت ہودؑ کو نبی بنا کر بھیجا گیا، جنہوں نے اپنی دعوت کا آغاز دیگر انبیا کی طرح کیا۔ آپ کی پہلی دعوت توحید اور شرک کی نفی تھی۔ (12) لیکن اس سرکش قوم نے ان کی باتوں کو پس پشت ڈالا۔ حضرت ہودؑ پر "جنون" کی تہمت لگائی جو ان کے خیال میں ان کے

خداؤں کے غضب کا نتیجہ تھا۔ یہ ان کے بیہودہ پن اور خرافات پرستی کی دلیل ہے۔ (13) ان کے کردار کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

''وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُواْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْاْ رُسُلَهُ وَاتَّبَعُواْ أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ''۔

یعنی: ''اور یہ (قومِ) عاد ہے، جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جابر (و متکبر) دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔'' (14)

قوم عاد کے اس انکار اور دعوت توحید کو ٹھکرانے پر ان پر سخت عذاب مسلط کیا گیا جس سے ان کا معاشرہ اور تہذیب ہلاک ہو گئی۔ ہر چند ان میں سے صاحب ایمان افراد عذاب سے محفوظ رہے۔ ''وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ''یعنی: اور جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا (تو) ہم نے ہود (علیہ السلام) کو اور ان کے ساتھ ایمان والوں کو اپنی رحمت کے باعث بچا لیا، اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات بخشی۔(15)

ایک اور قوم جو کہ ہلاک ہوئی اور ان کی ہلاکت کا ذکر قرآن میں ملتا ہے، قوم ثمود ہے۔ قوم ثمود، شکم کی اسیر اور ناز و نعمت سے بھری خوشحال زندگی سے بہرہ مند تھی۔(16) یہ لوگ چٹانوں کو کاٹ کر ان سے عالیشان عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔ جیسا کہ سورۃ الفجر میں ارشاد ہوتا ہے: '' وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ''۔ یعنی: اور ثمود (کے ساتھ کیا سلوک ہوا) جنہوں نے وادیٔ (قری) میں چٹانوں کو کاٹ (کر پتھروں سے سینکڑوں شہروں کو تعمیر کر) ڈالا تھا۔ (17) انہوں نے بھی قوم عاد کی طرح حضرت صالحؑ کو جھٹلایا اور وحی اور روز قیامت کا انکار کیا۔ یہ لوگ شرک میں بھی مبتلا تھے نیز جابر حکمرانوں کی پیروی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ قہر الٰہی میں مبتلا ہوئے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُواْ الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُواْ فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ۔ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْاْ فِيهَا أَلاَ إِنَّ ثَمُودَ كَفَرُواْ رَبَّهُمْ أَلاَ بُعْدًا لِّثَمُودَ۔''

یعنی: ''اور ظالم لوگوں کو ہولناک آواز نے آپکڑا، سو انہوں نے صبح اس طرح کی کہ اپنے گھروں میں (مُردہ حالت میں) اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا وہ کبھی ان میں بسے ہی نہ

تھے، یاد رکھو! (قومِ) ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا تھا۔ خبردار! (قومِ) ثمود کے لئے (رحمت سے) دوری ہے۔" (18)

## اقوام کی ہلاکت کے عوامل واسباب

یہاں ایک بات جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہلاکت کیسے آتی ہے اور وہ کیا عوامل اور اسباب ہیں جو معاشرے کو ہلاکت کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ ہلاکت کو دو صورتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہلاکت آسمانی اور زمینی بلاؤں سے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید میں سابقہ امم کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہلاکت کی دوسری صورت ایک قوم کا دوسرے قوم کے ہاتھوں ہلاک ہونا ہے۔ جس کا ثبوت تاریخ میں ہونے والی جنگیں دیتیں ہیں اور قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی واضح مثال کفار مکہ تھے جن کی مسلمانوں کے ساتھ جنگیں ہوئیں اور ان جنگوں کے نتیجہ میں ان کا معاشرہ ہلاک ہوا تھا، لیکن ان جنگوں میں بھی جو مومنین کی کافروں کے ساتھ ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد بھی شامل رہتی ہے۔(19) ان دو صورتوں کے علاوہ ہلاکت کی ایک اور صورت یہ بھی ہے کہ معاشرہ خود اندرونی طور پر شکست وریخت کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر زوال پذیر ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

کسی قوم کی ہلاکت کے عوامل اور اسباب کا دار ومدار خود اس معاشرے پر ہے۔ عموماً جب معاشرے اخلاقی برائیوں کا شکار ہوتے ہیں ہر چند مادی ترقی میں پیشرفتہ ہوتے ہیں لیکن ان کا معاشرہ متوازن نہیں رہتا اور کئی برائیوں میں شامل ہونے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اخلاقی برائیوں کے علاوہ جو بات زیادہ اہم ہے وہ خدا اور دین فطرت سے دوری ہے، اس کے علاوہ فساد، اجتماعی ظلم اور جابر حکمرانوں کی پیروی اور اطاعت بھی معاشرے کو ہلاکت کے دہانے پر پہنچا دیتی ہے۔

### اجتماعی ظلم اور فساد

ظلم معاشرے اور کسی بھی تہذیب کی تخریب میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اپنی ذات پر ظلم سے صرف انسان خود ہی متاثر نہیں ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات دوسروں پر ظلم وستم، اپنی ہی ذات پر ظلم کا شمار ہوتا ہے۔ کسی بھی چیز کو اس کے مقررہ اور مناسب مقام پر نہ رکھنا ظلم کہلاتا ہے۔ مثلاً انسان کا کسی مسئلے میں حد اعتدال سے بڑھ جانا یا پھر کمی کرنا ہے۔ ظلم کا لغوی معنیٰ اعتدال سے بڑھ جانا ہے اور اس میں تمام

اخلاقی رذائل شامل ہوتے ہیں۔ ظلم کا دوسرا معنی جو خاص ہے اس سے مراد دوسروں کو نقصان پہچانا اور اذیت دینا ہے۔(20) جس میں تہمت، غیبت، قتل، حقوق کا غصب کرنا وغیرہ شامل ہے۔ ظلم کی تین صورتیں ہیں یعنی: انسان کا اپنے آپ پر ظلم، خدا تعالیٰ پر ظلم اور دوسروں پر ظلم ہے۔ دوسروں پر ظلم کرنا بھی اجتماعی ظلم ہی ہے۔ انسان جب خدا اور اپنے مقام کو صحیح طرح نہیں پہچانتا اور اپنے مقام کو اپنی حد سے بڑھاتا ہے تو گویا اس نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ اور اس کا (دوسرے کے بارے میں) یہ رویہ اور سوچ، اس کے کردار کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اسی لیے قرآنی تعلیمات میں دوسروں پر ظلم کو اپنے پر ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔(21) خدا تعالیٰ پر ظلم کرنا یہ ہے کہ انسان شرک کا قائل ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لائے۔ تقریباً تمام ہلاک شدہ اقوام کی واضح خصوصیت یہی شرک اور ذات الٰہی کا انکار تھا۔ دوسروں پر ظلم یا پھر اجتماعی ظلم کی بنیاد بھی یہی انکار اور سرکشی ہے۔ جب انسان خدا اور اپنے مقام کو نہیں پہچانتا تو وہ دوسروں کے حقوق سے بھی چشم پوشی کرلیتا ہے جو ظلم و جور کا سبب بنتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ہر حکومت کے لیے ایک مدت معین کی ہوئی ہے۔ اگر حکمران رعیت کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیں تو اس کی مدت بڑھ جاتی ہے اور اگر ظلم سے کام لیں تو اس کی مدت میں کمی ہو جاتی ہے۔(22)

فساد بھی ظلم کی طرح اعتدال سے بڑھ جانا ہے اگرچہ اس کا مفہوم وسیع ہے اور ہر طرح کی زیادتی اور تباہی کے ضمن میں آتا ہے۔ سورۂ فجر میں عاد، ثمود اور فرعون کے معاشروں میں فساد کے عام ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: " الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ۔ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ۔ "یعنی" (یہ) وہ لوگ (تھے) جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی کی تھی۔ پھر ان میں بڑی فساد انگیزی کی تھی"(23) لہٰذا اس سرکشی اور فساد انگیزی کا نتیجہ عذاب اور ہلاکت کی صورت میں سامنے آیا۔" فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ" یعنی: تو آپ کے ربّ نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔(24)

فساد اور ظلم دونوں معاشروں کی جڑوں کو کھوکھلا کردیتے ہیں اور معاشرہ زوال کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اگر اس کا سدباب نہ کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے۔ ظلم کی طرح فساد کی بھی متعدد صورتیں ہیں: جس میں اعتقادی، اخلاقی واجتماعی اور مالی فساد شامل ہیں۔ اعتقادی فساد یہ ہے کہ انسان

اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھرائے، انبیاء سے دشمنی کرے اور ایمانیات کے تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ فساد کی اخلاقی صورت میں تمام اخلاقی رذائل یعنی: تکبر، حسد، منافقت اور جھوٹ وغیرہ کا عام ہونا ہے، جبکہ اجتماعی فساد میں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنا، ظلم و تعدی کرنا شامل ہوتے ہیں۔ فحاشی، لواطت اور ہر طرح کے منکرات اور فواحش بھی فساد میں شامل ہیں۔ خرید و فروخت میں دھوکہ دہی سے کام لینا، ناپ تول میں کمی کرنا، سود خوری اور حرام خوری بھی فساد ہی ہیں اور اس طرح فساد وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ فساد چاہے کسی بھی صورت میں ہو معاشرے اور اقوام کی حیات میں رکاوٹ اور ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

قرآن مجید میں بیان کی گئی سابقہ ہلاک شدہ اقوام کے خصائص میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہی ظلم اور فساد ہے اور یہی ظلم اور فساد ہی ان کی ہلاکت کا سبب بنا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ظلم اور فساد کا منشاء اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار اور تکبر ہے۔ یہ انکار اس بات کا باعث بنتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود مختار سمجھے اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرے۔ جب پورا معاشرہ ہی ایسا ہو جائے تو یقیناً اس معاشرے نے ہلاک ہی ہونا ہے، چاہے وہ زمینی یا آسمانی آفات سے ہو یا پھر اندرونی شکست و ریخت سے ہو۔ قرآن کریم ہلاکت اور نابودی کو ظالمین کا قطعی انجام بتاتا ہے۔(25) قرآن کے مطابق اگر ایک معاشرہ یا پھر اس کی ایک قابل توجہ اکثریت، ظلم و جور کے راستے پر چلے تو وہ معاشرہ ہلاک ہو جاتا ہے، کیونکہ ایسے معاشرے کو دوام حاصل نہیں ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک معاشرہ ظلم و جور سے بھر جائے اور اس کے باوجود اس کو دوام حاصل ہو۔(26)

## غیر اخلاقی کاموں کا ارتکاب

غیر اخلاقی اور انسانی مشغلے جن میں ہر قسم کے فواحش اور منکرات شامل ہوتے ہیں فساد کی ہی صورتیں ہیں۔ تاہم ان کو الگ سے بیان کرنے کی وجہ اس بات کا اندازہ لگانا ہے کہ اخلاقی انحطاط کس طرح ہلاکت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال قوم لوط کی ہے جنہوں نے اخلاقی بے راہروی کا کھلم کھلا اظہار کیا اور اخلاقی لحاظ سے اس قدر پست ہو گئے کہ حضرت لوط کی نصیحت ان کے کچھ کام نہ آئی۔ کہا گیا ہے کہ ان کی مجالس اور بیٹھکیں طرح طرح کے منکرات اور برے اعمال سے آلودہ تھیں وہ آپس میں رکیک جملوں اور فحش کلامی کا تبادلہ کرتے تھے، قمار بازی کرتے تھے، بچوں والے کھیل کھیلتے تھے، گزرنے والوں کو

کنکریاں مارتے تھے نیز طرح طرح کے آلات موسیقی استعمال کرتے تھے اور دوسروں کے سامنے برہنہ ہو جاتے تھے۔(27) لہٰذا اس قوم پر اللہ کے غضب کا نزول ہوا اور ان کا شہر مسمار اور تہ و بالا ہو گیا۔ اس وجہ سے انہیں "مدائن مؤتفکات" (تہ و بالا ہونے والا شہر) کہتے ہیں۔(28)

## جابر اور متکبر حکمرانوں کی پیروی

ایک اور چیز جو اُمتوں کی ہلاکت میں اہمیت کی حامل ہے وہ جابر اور متکبر سلاطین اور حکمرانوں کی پیروی ہے۔ قرآن کریم میں بھی واضح الفاظ میں ہلاک شدہ اقوام کی خصوصیات میں سے ایک خصلت مستکبرین کی پیروی کو کہا گیا ہے۔

" وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ۔ "(29)

یعنی: "اور یہ (قومِ) عاد ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جابر (و متکبر) دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔"

حضرت صالحؑ نے بھی اپنی قوم کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"فَاتَّقُوا اللهَ وَأَطِيعُونِ۔ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ۔ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ"(30)

یعنی: "پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا کہنا نہ مانو۔ جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور (معاشرہ کی) اصلاح نہیں کرتے۔" (30)

یہ بات واضح رہے کہ لیڈرشپ یعنی رہبری ہمیشہ کسی بھی قوم کی سعادت اور شقاوت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر قوم کا رہنما اور ملک کی باگ و دوڑ سنبھالنے والا خدا ترس ہو تو وہ قوم کی ہدایت توحید پرستی کی طرف کرے گا، لیکن اگر نفسانی خواہشات کا پابند ہو اور فتنہ و فساد کا عادی ہو تو قوم بھی پستی اور انحطاط کی راہ پر چلے گی اور اُس میں ہر قسم کی منکرات عام ہو جائیں گی۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اجتماع اور انسانی معاشرے جب راہ حق سے منحرف ہو جائیں اور الٰہی نعمات کو فساد اور انحراف کے راستے میں استعمال کریں تو ہلاکت ان معاشروں کا مقدر بن جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ گناہوں اور زمین پر فتنہ و فساد اور دنیاوی مشکلات اور آسمانی بلاؤں کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور یہی الٰہی قوانین یا سنن الٰہی کہلاتی ہیں۔(31)

*****

# حوالہ جات


1۔ سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)، خطبہ قاصعہ 190

2۔ سید رضی، نہج البلاغہ، (ترجمہ مفتی جعفر حسین)، مکتوب 69

3۔ سورہ یوسف، آیت نمبر 111

4۔ سورۃ آل عمران، آیت نمبر 137۔

5۔ نجفی علمی، محمد جعفر، برداشتی از جامعہ و سنن اجتماعی در قرآن، سازمان چاپ و انتشارات وزارت فرھنگ و ارشاد اسلامی، 1371ھ۔ش، ص161

6۔ سہراب پور، ہمت، سنتھای الٰہی، دفتر انتشارات اسلامی، 1375ھ۔ش، ص6

7۔ سورۃ الانفال، آیت نمبر 38

8۔ سورۃ الانفال، آیت نمبر 38

9۔ سورۃ الانعام، آیت نمبر 42-45

10۔ شیرازی، ناصر مکارم، قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ، انصاریان پبلیکیشنز، 2004م، ص73

11۔ سورۂ فجر، آیت نمبر 7،8

12۔ شیرازی، ناصر مکارم، قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ، انصاریان پبلیکیشنز، 2004م، ص74

13۔ شیرازی، ناصر مکارم، قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ، انصاریان پبلیکیشنز، 2004م، ص77

14۔ سورۂ ہود، آیت نمبر 59

15۔ سورۂ ہود، آیت نمبر 58

16۔ شیرازی، ناصر مکارم، قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ، انصاریان پبلیکیشنز، 2004م، ص84

17۔ سورۂ فجر، آیت نمبر 9

18۔ سورۂ ھود، آیت نمبر 67-68

19۔ نجفی علمی، محمد جعفر، برداشتی از جامعہ و سنن اجتماعی در قرآن، سازمان چاپ و انتشارات وزارت فرھنگ و ارشاد اسلامی، 1371ھ۔ش، ص163

20۔ حسینی دشتی، سید مصطفیٰ، معارف و معاریف دایرۃ المعارف جامع اسلامی، موسسہ فرھنگی آرایہ، 1379ھ۔ش، ج7، ص134

21۔ عسگری، حبیب اللہ، ظلم اجتماعی و آثار آن، دانشنامہ موضوعی قرآن، 1394ھ۔ش۔ بحوالہ - http://www.maarefquran.com

22۔ حسینی دشتی، سید مصطفیٰ، معارف و معاریف دایرۃ المعارف جامع اسلامی، موسسہ فرھنگی آرایہ، 1379ھ۔ش، ج7، ص135

23۔ سورۂ فجر، آیت نمبر12،11

24۔ سورۂ فجر، آیت نمبر13

25۔ سہراب پور، ہمت، سنتھای الٰہی، دفتر انتشارات اسلامی، 1375ھ۔ش، ص56

26۔ سہراب پور، ہمت، سنتھای الٰہی، دفتر انتشارات اسلامی، 1375ھ۔ش، ص57

27۔ شیرازی، ناصر مکارم، قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ، انصاریان پبلیکیشنز، 2004م، ص176

28۔ شیرازی، ناصر مکارم، قصص القرآن منتخب از تفسیر نمونہ، انصاریان پبلیکیشنز، 2004م، ص159

29۔ سورۃ ہود، آیت نمبر59

30۔ سورۃ شعراء، آیت نمبر150-152

31۔ نجفی علمی، محمد جعفر، برداشتی از جامعہ و سنن اجتماعی در قرآن، سازمان چاپ و انتشارات وزارت فرھنگ و ارشاد اسلامی، 1371ھ۔ش، ص218

# امام علیؑ کی نگاہ میں وحدت کی ضرورت اور اہمیت

(نہج البلاغہ کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد افضل*
dr.muhammadafzalkarimi@gmail.com

**کلیدی کلمات:** اسلامی وحدت، سیرت رسولؐ، اہل کوفہ، خوارج مسلمان معاشرہ

## خلاصہ

وحدت کی اہمیت اور ضرورت شروع ہی سے نمایاں تھی، نبی اکرمؐ نے اپنی حیات طیبہ میں عملاً اس کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا اور اسلامی ریاست کے آغاز ہی میں مواخات اسلامی کے ذریعے مسلمانوں کو اسلامی بھائی چارگی کے بندھن میں باندھ دیا۔ مسلمانوں کے دو مکاتب (شیعہ و سنی) کے درمیان اختلافات صرف فقہی اور فرعی ہی نہیں، بلکہ عقائد میں بھی اختلاف نظر ہے، اس کے باوجود سب مسلمان برادرانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ علمی اختلاف رائے کوئی عیب نہیں ہے۔ ہم اختلاف نظر رکھنے والے سب انسانوں کو، ایک ہی ملک اور ایک ہی شہر میں امن وسکون کی زندگی گزارتا دیکھ سکتے ہیں۔ جب مادی معاملات میں وسیع تر اتحاد قائم ہو سکتا ہے تو پھر عام زندگی میں اتحاد واتفاق کیوں نہیں ہو سکتا؟ امام علیؑ نے اس اہم موضوع کو عملی طور پر زندہ رکھا ہے اور مختلف مواقع پر اس کی ضرورت اور اہمیت کو بھی بیان کیا ہے اور معاشرے میں تفرقے کے نقصانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سید رضیؒ نے امام علیؑ کے خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار کو نہج البلاغہ کے نام سے جمع کیا ہے جو آج تک ایک علمی ورثے کی شکل میں زندہ وجاوید ہے۔ امامؑ کے ان نورانی فرامین سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قوموں کی عزت و شرافت اتحاد میں مضمر ہے اختلافات خود بخود ختم ہونے والے نہیں۔ اگر امت اسلامی کا درد اور دینی غیرت رکھنے والے ہوشیاری اور تدبر کے ساتھ کوشش کریں تو ممکن ہے کہ اختلاف میں کسی حد تک کمی آجائے۔ یہ کوشش امت محمدیہ اور اسلامی دنیا کی سب سے بڑی خدمت ہو گی یہی امام علی علیہ السلام کی خواہش بھی ہے اور ان کی سیرت بھی۔

*۔ شعبہ علومِ اسلامی، جامعہ کراچی

**مقدمہ**

وحدت اسلامی کی اہمیت اور ضرورت ظہور اسلام سے ہی نمایاں رہی ہے۔اس کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ وحدت اسلامی قرآن کریم میں مسلمانوں کی شان وشوکت اور ان کی عظمت کی پاسداری کے عنصر کے طور پر اجاگر ہوا ہے اور کئی آیتوں میں خدا نے مسلمانوں کو اختلاف اور تفرقے سے شدت کے ساتھ منع کیا ہےاور اس کے خطرناک عواقب کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صاحب قرآن، نبی مکرم اسلام ﷺ نے بھی اپنی حیات طیبہ میں عملی اور کلامی طور پر اس کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا اور آپؐ نے مدینہ میں اسلامی ریاست کی تشکیل کے پہلے سال ہی مواخات اسلامی کے ذریعے مسلمانوں کو اسلامی بھائی چارگی کے بندھن میں باندھ دیا۔ جنگ ہو یا امن، سفر ہو یا حضر، خوشی ہو یا غم، تنگی ہو یا فراوانی۔۔۔غرض آپؐ نے اپنی پوری حیات طیبہ کو وحدت اور انسجام کا عملی نمونہ بناکے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ جس سے برادری اور بھائی چارگی کی ایک نئی تصویر دنیا کے سامنے آئی۔ آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے بھی اس اہم اسلامی میراث سے مشکل وقت بھی اغماض نظر نہیں کیااور ہر قسم کی زیادتی اور ظلم کا سامنا کرنے کے باوجوداپنی ذات اور اپنے مفادات کوکسی بھی مرحلے پر اسلامی وحدت ویکجہتی پرفوقیت نہیں دی۔ اس میں کوئی شک نہیں مسلمانوں کے دو مکاتب(شیعہ و سنی)کے درمیان اختلافات صرف فقہی اور فرعی ہی نہیں، بلکہ اعتقادات میں بھی اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اہل تشیع کے تین بڑے مکتب فکر ہیں جن کو اسماعیلیہ، زیدیہ اور جعفریہ یا اثنا عشریہ کہتے ہیں۔ اسی طرح اہل سنت میں مذاہب اربعہ کے علاوہ وہابی فرقہ بھی ہے۔اسی طرح علم کلام کے مباحث اشاعرہ، معتزلہ اور کرامیہ کے اختلافات پر مشتمل ہیں۔ متنوع مسائل میں اہل حدیث اور اہل سنت کے فقہا کی روش اور طور طریقوں کے درمیان بھی اختلافات موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ سب مسلمان برادرانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ علمی اختلاف رائے کوئی عیب نہیں ہے۔ ہم ان سارے انسانوں کو، جو اختلاف نظر رکھتے ہیں، ایک ہی براعظم، ایک ہی ملک، ایک ہی شہر، ایک ہی گاوں، یہاں تک کہ ایک ہی گھر کے

اندر امن وسکون کی زندگی گزارتا دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کے بعض علاقوں میں وہ عملاً دشمنی اور نزاع سے دور رہ کر اپنے اپنے خاص نظریات کی حفاظت کرتے ہوئے ایک مسالمت آمیز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج مغربی دنیا میں قائم مختلف قسم کے اتحاد کا ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں، یورپی اتحاد، نیٹو کا اتحاد، اسی طرح مختلف قسم کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کے ذریعے وہ اپنی انفرادی طاقت کو یکجا کر رہے ہیں، جس نے انہیں سرحدی حد بندیوں سے آزاد کر دیا ہے، وہ ایک ہی گھر کے افراد شمار ہوتے ہیں اور درد مشترک رکھتے ہیں، غرض یورپ اور مغرب کی دور اندیشی نے انہیں وحدت کے سایے میں ایک عظیم قوم کی شکل میں دنیا کے سامنے نمودار کر دیا ہے۔ جب مادی معاملات کو سامنے رکھتے ہوئے وسیع تر اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ تو پھر کیوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد واتفاق کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جبکہ ہم مادی معاملات سے بڑھ کے معنوی اور ایمانی رشتے میں بھی بندھے ہوئے ہیں۔ امام علیؑ نے رسول اکرم ﷺ کے حقیقی وارث ہونے کے ناطے اس اہم موضوع کو عملی طور پر زندہ رکھنے کے ساتھ مختلف مواقع پر اس کی ضرورت اور اہمیت کو بھی بیان کیا ہے اور معاشرے میں تفرقے کے نقصانات اور عواقب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سید رضیؒ نے امام علی علیہ السلام کے خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار کو نہج البلاغہ کے نام سے جمع کیا ہے جو آج تک ایک علمی ورثے کی شکل میں زندہ وجاوید ہے۔

## اتحاد اور وحدت عظیم نعمت

نہج البلاغہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علی علیہ السلام اسلامی اتحاد کو خدا کی عظیم نعمتوں میں سے قرار دیتے تھے۔ اسی لیے آپ نے کوفیوں کی شدید الفاظ میں مذمت کی۔ چونکہ انہوں نے اس الٰہی نعمت کی قدر نہیں کی تھی اس ضمن میں آپ نے فرمایا:

> ”دیکھو تم نے اطاعت کے بندھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیا اور زمانہ جاہلیت کے طور طریقوں سے اپنے گرد کھچے ہوئے حصار میں رخنہ ڈال دیا خدا وند عالم نے اس امت کے لوگوں پر اس نعمت بے بہا کے ذریعہ سے لطف واحسان فرمایا ہے کہ جس کی قدر وقیمت کو مخلوقات میں سے کوئی نہیں پہچانتا کیونکہ وہ ہر ٹھہرائی ہوئی قیمت سے گراں تر اور ہر

شرف و بلندی سے بالاتر ہے۔اور وہ یہ کہ ان کے درمیان انس و یکجہتی کا رابطہ قائم کیا کہ جس کے سایہ میں وہ منزل کرتے ہیں ،اور جس کے کنار(عاطفت)میں پناہ لیے ہیں"۔(1)

اسی طرح آپ نے وحدت کو خدا کا عظیم احسان قرار دیا ہے اس سلسلے میں آپ نے فرمایا:

"دیکھو کہ اللہ نے ان پر کتنے احسانات کئے کہ ان میں اپنا رسولؐ بھیجا کہ جس نے اپنی اطاعت کاانہیں پابندبنایا اور انہیں ایک مرکز وحدت پر جمع کردیا"۔(2)

امام علی علیہ السلام کی نگاہ میں اختلاف اور تفرقہ در حقیقت اسلامی تعلیمات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کو کوفیوں نے اپنایا تھا امام نے اسی وجہ سے کئی مرتبہ ان کی مذمت کی۔ ان کے درمیان دورجاہلیت کی برائیوں نے پنپنا شروع کیا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں جنگوں اوراختلافات نے لوگوں کا سکون چھین لیا تھا۔ اس قسم کی جنگیں عرب کے مختلف قبائل کے درمیان معمولی سی چیزوں پہ ہوتی رہتی تھیں جو نسل در نسل جاری رہتیں۔ ظہور اسلام کے بعد اسلام کی حیات بخش تعلیمات کی روشنی میں ان کے درمیان موجود تمام جاہلی عصبیتیں ختم ہو گئی، بھائی چارگی کی ایک نئی فضا نے جنم لیا جس نے معاشرے کو امن ومحبت کا گہوارہ بنا دیا۔امام علیؑ اس دور کے لوگوں کو اس نعمت بے بدیل کی یاد دہانی کرا رہے ہیں تاکہ گزشتہ سے درس لیتے ہوئے اپنے رہبر و رہنما کی فرامین پہ کان دھر کے اتحاد کی نعمت سے مالا مال ہوں۔ امامؑ کی نگاہ میں اتحاد کی اہمیت اس بات سے بھی عیاں ہوتی ہے کی آپ نے اُمت کی مجموعی مصلحت کی خاطر وفات رسولؐ کے بعد اپنے مسلمہ اور منصوص حقوق کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیا جو آج بھی اُمت کے لیے ایک درس ہے۔ ہم بہت سے جزئی معاملات میں اُمت کے اہم مصالح کو پامال کرنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں، جو اُمت کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر رہا ہے۔ آپ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

"پھر جب رسول ﷺ کی وفات ہوگئی تو ان کے بعد مسلمانوں نے خلافت کے بارے میں کھینچاتانی شروع کردی۔ اس موقع پر بخدا مجھے یہ کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا اور نہ

میرے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ پیغمبر ﷺ کے بعد عرب خلافت کا رخ ان کے اہل بیتؑ سے موڑیں گے اور نہ یہ کہ ان کے بعد اُسے مجھ سے ہٹا دیں گے۔" (3)

آپ نے خلافت ظاہری کو دین کی خاطر قبول کیا، چونکہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اسلام ہی وحدت اسلامی کا بنیادی عامل ہے اگر ظہور اسلام کے بعد مسلمان ایک پلیٹ فارم پر متفق نظر آئے تھے تو اس کا سبب دین مبین اسلام ہی تھا جس نے ایک ہی صف میں سب کو یکجا کیا۔آپ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

"یہاں تک میں نے دیکھا کہ مرتد ہونے والے اسلام سے مرتد ہو کر محمد ﷺ کے دین کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔اب میں ڈرا کہ اگر کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے میں اسلام اور اہل اسلام کی مدد نہ کروں گا تو یہ میرے لیے اس سے بڑھ کر مصیبت ہوگی جتنی یہ مصیبت کہ تمہاری یہ حکومت میرے ہاتھ سے چلی جائے جو تھوڑے دنوں کا اثاثہ ہے۔اس میں کی ہر چیز زائل ہوجائے گی۔اس طرح جیسے سراب بے حقیقت ثابت ہے یا جس طرح بدلی چھٹ جاتی ہے چناچہ میں ان بدعتوں کے ہجوم میں اٹھ کھڑا ہوا یہاں تک کہ باطل دب کر فنا ہوگیا اور دین محفوظ ہو کر تباہی سے بچ گیا۔" (4)

امام علیؑ کے اس کلام سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں وحدت اسلامی کی از حد اہمیت تھی انہوں نے سالہا سال تنہائی میں زندگی گزارنے کے بعد اُمت کی شدیدخواہش پرزمام حکومت اسلامی اتحاد کی بنیاد(اسلام) کو محفوظ بنانے کے لیے قبول کی تھی۔

آپؑ نے اسلامی اتحاد کو معاشرے میں عملی شکل دینے کے لیے جزئی معاملات میں آپس میں الجھنے سے مسلمانوں کو منع کیاہے، چونکہ مسلمانوں کے پاس مشترکات ہی وہ عوامل ہیں جن کو بنیاد بنا کر اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ امامؑ ان لوگوں مذمت کر رہے ہیں جو فرعی اور جزئی احکام میں آپس میں دست گریباں ہوتے ہیں:

"جب ان میں سے کسی ایک کے سامنے کوئی معاملہ فیصلہ کے لیے پیش ہوتا ہے تووہ اپنی رائے سے اس کا حکم لگادیتا ہے پھر وہی مسئلہ بعینہٖ دوسرے کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ

اس پہلے کے حکم کے خلاف حکم دیتا ہے پھر یہ تمام کے تمام قاضی اپنے اس خلیفہ کے پاس جمع ہوتے ہیں جس نے انہیں قاضی بنا رکھا ہے تو یہ وہ سب کی رایوں کو صحیح قرار دیتا ہے حالانکہ ان کا اللہ ایک، نبی ایک اور کتاب ایک ہے(انہیں غور کرنا چاہئے) کیا اللہ نے انہیں اختلاف کا حکم دیا تھا اور یہ اختلاف کر کے اس کا حکم بجا لاتے ہیں یا اس نے حقیقتاً اختلاف سے منع کیا ہے اور یہ اختلاف کر کے عمداً اس کی نافرمانی کرنا چاہتے ہیں۔" (5)

## مشترکات کو بنیاد بنانے کی ضرورت

اسی طرح آپ نے صفین کے حالات کو بیان کرتے ہو ایک مکتوب میں بھی اسلامی اتحاد کی بنیادوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کی موجودگی میں فرعی اختلافات کو نزاع کا مسئلہ بنایا نہیں جا سکتا ہے:

"ابتدائی صوتحال یہ تھی کہ ہم اور شام والے آمنے سامنے آئے۔ اس حالت میں کہ ہمارا اللہ ایک، نبی ایک اور دعوت اسلام ایک تھی، نہ ہم ایمان باللہ اور اس کے رسول کی تصدیق میں ان سے کچھ زیادتی چاہتے تھے، اور نہ وہ ہم سے اضافہ کے طالب تھے بالکل اتحاد تھا۔" (6)

بنابر ایں مذکورہ بالا فرمائشات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی اتحاد کے لیے مشترکات کو بنیاد بنانے کی ضرورت ہے۔ اُمت کے درمیان اگر کوئی معاشرتی، سیاسی یا فرعی اور جزئی اختلاف پیدا ہو جائے تو مشترکات کو سامنے رکھ کے درمیانی حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں اُمت کے درمیان واضح ترین مشترکات خود خدا کی ذات اقدس، کلام الٰہی اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت و سنت ہیں، جن کو بنیاد کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

## قرآن کریم اور اتحاد اسلامی

قرآن کریم کئی جہتوں سے مسلمانوں کے لیے اتحاد کا محور ہے۔ ایک طرف قرآنی تعلیمات تمام انسانوں کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص باعث ہدایت واتحاد ہیں جن میں

تفرقے کی مذمت اور گزشتہ اقوام کی تفرقہ آمیز سرگزشت بیان ہو ئی ہے۔ جن سے درس لے کے اتحاد کی رسی کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف خود اس کتاب کا کلام الٰہی ہونا اور عموم مسلمین کے نزدیک اس کی حجیت اور قبولیت بھی اتحاد کا اہم عامل ہے۔ یعنی تمام مسلمان اس بات پر بلا تفریق عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اس کا احترام اور اقبال سب پر فرض ہے۔

امام علیؑ نے کئی موارد میں قرآن کریم کی اہمیت کو بیان کیا ہے، چونکہ ہمارا موضوع نہج البلاغہ میں امامؑ کے ارشادات کی حد تک ہے۔ اسی لیے نہج البلاغہ میں امامؑ کے جو اقوال اور ارشادات نقل ہوئے ہیں ان پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ نہج البلاغہ میں کئی ایسے موارد ہیں جن مین امامؑ نے قرآن کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کیا ہے۔ قبیلہ ربیعہ اور یمن کے درمیان صلح کے موقع پر آپؑ نے اس الٰہی منبع کے حوالے سے فرمایا کہ:

"یہ وہ معاہدہ ہے جس پر اہل یمن نے وہ شہری ہوں یا دیہاتی اور قبیلہ ربیعہ نے خواہ وہ شہر میں آباد ہوں یا بادیہ نشین ہوں سب نے اتفاق کیا ہے کہ وہ سب کے سب کتاب اللہ پر ثابت قدم رہیں گے،اس کی طرف دعوت دیں گے، اسی کے ساتھ حکم دیں گے اور جو اس کی طرف دعوت دے گا اور اس کی رو سے حکم دے گا اس کی آواز پر لبیک کہیں گے، نہ اس کے عوض کوئی فائدہ چاہیں گے، اور نہ اس کے کسی بدل پر راضی ہوں گےاورجو کتاب اللہ کے خلاف چلے گا اوراسے چھوڑے گا اس کے مقابلہ میں متحد ہو کرایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے۔" (7)

اس کے علاوہ آپ نے حکمیت کے معاملے میں بھی قرآن کی اہمیت اورضرورت کی طرف اشارہ فرمایا:

"ہم نے آدمیوں کو نہیں، بلکہ قرآن کو حکم قرار دیاتھا، چونکہ یہ قرآن دو دفتیوں کے درمیان ایک لکھی ہوئی کتاب ہے کہ جو زبان سے بولا نہیں کرتی اس لیے ضرورت تھی کہ اس کے لیے کوئی ترجمان ہو اور وہ آدمی ہی ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کیا کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں نے ہمیں یہ پیغام دیا کہ ہم اپنے درمیان قرآن کو حکم ٹھہرائیں تو

ہم ایسے لوگ نہ تھے کہ اللہ کی کتاب سے منہ پھیرے لیتے۔ جبکہ حق سبحانہ کا ارشاد ہے کہ اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو(اس کا فیصلہ نپٹائے کے لیے)اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی کتاب کے مطابق حکم کریں۔" (8)

اسی طرح آپ نے ابو موسی اشعری اور عمر ابن عاص کو حکم معین کرنے کے علل واسباب بیان کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو زندہ کرنے کو بنیادی ہدف اور سبب قرار دیا:

"اور وہ دونوں (ابوموسیٰ، عمرو ابن عاص) توصرف اس لیے ثالث مقرر کیے گئے تھے کہ وہ انہی چیزوں کو زندہ کریں جنہیں قرآن نے زندہ کیا ہے اور انہی چیزوں کو نیست و نابود کریں جنہیں قرآن نے نیست و نابود کیا ہے۔ کسی چیز کے زندہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس پر یکجہتی کے ساتھ متحد ہوا جائے اور اس کے نیست و نابود کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔"(9)

اس کے علاوہ بھی ایسے موارد بھی ہیں جہاں امام علیؑ نے قرآن کی اہمیت اور مسلمانوں کے نزدیک اجتماعی طور پر اس کی اقبالیت کو بیان کیا ہے اور لوگوں کو باور کرایا ہے کہ اگر قرآن کی تعلیمات پر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی مسائل کا آسان حل دریافت کیا جاسکتا ہے اور اہل بیتؑ کی عظمت اور اسلام کی سیاسی اور مذہبی قیادت کی درست سمت کا بھی تعین ہو سکتا ہے۔

## رسالت سرچشمہ وحدت

رسول اکرم ﷺ کی رسالت اور پیغام رسالت وہ اہم محور ہے جس نے تمام مسلمانوں کو اپنے حصار میں لیاہوا ہے۔ تمام اسلامی مسالک فرعی اور جزئی اختلافات رکھنے کے باوجود ان میں یہ اجماعی نظر ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی سیرت وسنت وہ اہم عوامل ہیں جن کواپنے عقیدے کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ یہ ہر گز ممکن نہیں کہ کوئی پیغمبر اکرم ﷺ کی رسالت اور آپؐ کی سنت اور سیرت کا سرے سے منکر ہو اور دوسری طرف خود کو مسلمان بھی کہلوائے۔ بنابراین مسلمانوں کو تمام تر فروعی اختلافات کے باوجود جن چیزوں نے اٹوٹ رشتے

میں باندھ کر رکھا ہے ان میں سے ایک پیغمبرﷺ کی رسالت بھی ہے۔ نہج البلاغہ میں بھی کئی موارد میں امام علیؑ نے رسولﷺ کی رسالت کی اہمیت اور اس کے تاریخی کردار کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپؑ نے فرمایا:

"اسی طرح مدتیں گزر گئیں، زمانے بیت گئے، باپ داداؤں کی جگہ پر ان کی اولادیں بس گئیں یہاں تک کہ اللہ سبحانہ نے ایفائے عہد و اتمام نبوت کے لیے محمدﷺ کو مبعوث کیا جن کے متعلق نبیوں سے عہد وپیمان لیا جا چکاتھا جن کے علامات (ظہور) مشہور، محل ولادت مبارک ومسعود تھا۔ اس وقت زمین پر بسنے والوں کے مسلک جدا جدا خواہشیں متفرق وپراگندہ اور راہیں الگ الگ تھیں۔"(10)

اس کے علاوہ آپ نے سرزمین ذی قار میں جو خطبہ دیا اس میں بعثت کے فوائد اور اس کردار کو واضح انداز میں بیان کیا ہے اس سلسلے میں آپؑ نے فرمایا:

"اللہ نے محمدﷺ کو اس وقت بھیجا جب کہ جب عربوں میں کوئی کتاب (آسمانی) پڑھنے والا کوئی نہیں تھا نہ کوئی نبوت کا دعوے دار۔ آپؐ نے ان لوگوں کو ان کے صحیح مقام پر اتارا، اور نجات کی منزل پر پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے سارے خم جاتے رہے اور حالات محکم واستوار ہوگئے۔"(11)

اسی طرح ایک اور خطبے میں آپؑ نے بعثت رسولﷺ کی وجہ سے معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انہیں بیان کیا۔ یقیناً یہ تمام چیزیں بعد میں ایک متحد اور منظّم معاشرے کے لیے زمینہ ساز واقع ہوئیں اس حوالے سے آپؑ نے فرمایا:

"پیغمبرﷺ کو اس وقت میں بھیجا کہ جب لوگ حیرت و پریشانی کے عالم میں گم کردہ راہ تھے اور فتنوں میں ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ نفسانی خواہشوں نے انہیں بھٹکا دیا تھا اور غرور نے بہکادیا تھا اور پھر جاہلیت نے ان کی عقلیں کھو دی تھیں اور حالات کے ڈانواں ڈول ہونے اور جہالت کی بلاوں کی وجہ سے حیران وپریشان تھے چناچہ نبیﷺ نے انہیں سمجھانے کا پور احق ادا کیا خود سیدھے راستے پر جمے رہے اور حکمت و دانائی اور اچھی نصیحتوں کی طرف انہیں بلاتے رہے۔"(12)

اس طرح آپ نے بعثت رسول ﷺ کو عرب معاشرے میں جاری کدورتوں کے شعلوں کو بجا کے الفت و محبت کے چراغ روشن ہونے کا باعث قرار دیا یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کی بعثت اور آپ کی سعی مسلسل کی وجہ سے کم مدت میں ہی سامنے آئی۔ آپ نے اس حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"خدا نے ان (آنحضرتؐ) کی وجہ سے فتنے دبا دیئے اور عداوتوں کے شعلے بجا دیئے بھائیوں میں الفت پیدا کی اور جو (کفر میں) اکٹھے تھے انہیں علیٰحدہ علیٰحدہ کردیا۔" (13)

امام علیؑ کے ان نورانی ارشادات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے کسی بھی مشکل مرحلے میں بلاتفریق قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کی مودت اور اطاعت کو اپنی زندگی کا شیوہ قرار دینے کی ضرورت ہے تاکہ فوز حقیقی کے مستحق قرار پائیں۔ امامؑ کے کلام سے یہ بات بھی واضح ہوئی کی خدا نے انسانوں کو جنگ و جدال اور کفر وجہل کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے قرآن کو اپنے حبیب، نبی مکرم اسلام ﷺ پر نازل کرکے انہیں مبعوث بہ رسالت کیا۔

اس وقت کا عرب معاشرہ قبائلی اور نسلی اختلافات کا شکار تھا جس کے سبب کئی نسلیں بے مقصد جنگوں اور اختلافات کی نظر ہو گئی تھی اور کئی صدیوں سے جاری ان جنگوں نے انہیں بلآخر ایک نئی تبدیلی کا منتظر بنا دیا تھا اور وہ اندر سے کسی ایسی تبدیلی کے خواہاں تھے جو انہیں وحشت و بربریت سے نکال کر امن و محبت کے راستے پر گامزن کرے۔ اسی دوران رسول اکرم ﷺ کی بعثت ان کے لیے رحمت و برکت کا باعث ہوئی۔ اور وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ایک دم الفت و محبت کے رشتے میں بندھ گئے۔

یہ معاملہ زمان نزول قرآن تک محدود نہیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ آج مسلمانوں میں وہی زمانہ جاہلیت کی خصلتیں آہستہ آہستہ سامنے آ رہی ہیں اورایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی سنت جاہلی نے آج ہر مسلمان کے گھر بسیرا کر لیا ہے ایسے میں امام علیؑ کے ان فرامین پر غور کرکے صدر اسلام کی طرح مسلمانوں کے درمیان مشترکات کی بنیاد پر دوبارہ اسلامی بھائی چارگی کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس قرآن اور رسول اکرم ﷺ وہ سرمایہ حیات جن پر ہم متفق ہیں۔

لہٰذا آج اس بات کی اشد ضرورت ہیں کہ ہم قرآنی تعلیمات کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور سنت کو وحدت کے احیا کے لیے بنیاد بنائیں۔ جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام ایک پرامن اور صلح وآشتی کا مذہب ہے تو اس عقیدہ کا آغاز اپنے ہی گھر سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اپنے آشیانے کو تفرقے کی آگ سے جلا کے دوسروں کا گھر روشن کرنے کی کوشش کریں تو کوئی ہماری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ چونکہ آج کے دور میں معقولات سے محسوسات پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے لہٰذا جو ہم کہتے ہیں وہ عملی طور پر کر دکھانے کی بھی ضرورت ہے۔

## حاکم اور رعایا کے فرائض

اس کے علاوہ امام علیؑ نے وحدت اسلامی کے تحقق کے لیے ان تمام ابزار اور وسائل سے استفادہ کیا جو مستقیم یا غیر مستقیم طور پر کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ نیز آپؑ نے ان تمام اسلامی اقدار کو بھی بیان کیا جو وحدت اسلامی کو معاشرے میں دوام بخشنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسی ضمن میں آپؑ نے حاکم اور رعایا کو معاشرے کے دو اہم عناصر کے طور پر متعارف کراتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کے دوسرے پر جو حقوق ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا چونکہ معاشرے کے ان دو اہم ستونوں کے درمیان اگر توازن باقی نہ رہے تو ہرج ومرج پیدا ہونے کے قوی امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں آپؑ نے فرمایا:

> ”سب سے بڑا حق کہ جسے اللہ سبحانہ نے واجب کیا ہے حکمران کا رعیت پر اور رعیت میں سے ہر ایک کے لئے فریضہ بنا کر عائد کیا ہے اور اسے ان میں رابطہ محبت قائم کرنے اور ان کے دین کو سرفرازی بخشنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ رعیت اسی وقت خوش حال رہ سکتی ہے جب حاکم کے طور طریقے درست ہوں اور حاکم اسی وقت صلاح و درستگی سے آراستہ ہوسکتا ہے جب رعیت اس کے احکام کی انجام دہی کے لیے آمادہ ہو۔“(14)

اسی سلسلے میں آپؑ نے مزید فرمایا:

> ”جب رعیت فرمانروا کے حقوق پورے کرے اور فرمانروا رعیت کے حقوق سے عہدہ برآ ہو تو ان میں حق باوقار، دین کی راہ میں استوار اور عدل و انصاف کے نشانات برقرار

ہو جائیں گے اور پیغمبر ﷺ کی سنتیں اپنے ڈھرے پر چل نکلیں گی اور زمانہ سدھر جائے گا۔ بقائے سلطنت کے توقعات پیدا ہو جائیں گے اور دشمنوں کی حرص و طمع یاس و ناامیدی سے بدل جائے گی اور جب رعیت پر ظلم ڈھانے لگے تو اس موقع پر ہر بات میں اختلاف ہوگا، ظلم کے نشانات ابھر آئیں گے، دین میں مفسدے بڑھ جائیں گے، شریعت کی راہیں متروک ہو جائیں گی، خواہشوں پر عمل درآمد ہوگا۔ شریعت کے احکام ٹھکرادیئے جائیں گے، نفسانی بیماریاں بڑھ جائیں گی اور بڑے سے بڑے حق کو ٹھکرا دینے اور بڑے سے بڑے باطل پر عمل پیرا ہونے سے بھی کوئی نہ گھبرائے گا۔ ایسے موقع پر نیکو کار، ذلیل اور بدکار، باعزت ہوجاتے ہیں اور بندوں پر اللہ کی عقوبتیں بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس حق کی ادائیگی میں ایک دوسرے کو سمجھانا بجھانا اور ایک دوسرے سے بخوبی تعاون کرنا تمہارے لئے ضروری ہے اس لیے کہ کوئی شخص بھی اللہ کی اطاعت و بندگی میں اس حد تک نہیں پہنچ سکتا کہ جس کا وہ اہل ہے، چاہے وہ اس کی خوشنودیوں کو حاصل کرنے کے لیے کتنا ہی حریص ہو، اور اس کی عملی کوششیں بھی بڑھی چڑھی ہوئی ہوں۔ پھر بھی اس نے بندوں پر یہ حق واجب قرار دیا ہے کہ وہ مقدور بھر نصیحت کریں اور اپنے درمیان حق کو قائم کے لئے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹھائیں۔" (15)

امام علیؑ کے ان فرامین سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں امن اور اتحاد کے قیام میں حاکم وقت کا طرز عمل انتہائی اہمیت کا حامل ہے اسی ضمن میں رعایا کے حقوق کا خیال رکھنا اور رعایا کی جانب سے بھی اس قسم کا طرز عمل معاشرے میں ثبات اور وحدت کے لیے لازم وملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام علیؑ نے اپنے دور اقتدار میں رعایا کے حقوق کو اولیت دی اور اس معاملے میں کسی سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔

## حاکمیت اور وحدت

معاشرے میں ثبات اور یکجہتی کے قیام میں حاکمیت کا کردار انتہائی اہم ہے جس معاشرے کے اندر حاکمیت نہیں وہ انتشار کا شکار رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ کئی احادیث میں معاشرے میں

زمامدار اقتدار کا ہونا معاشرے کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اقتدار اور حاکمیت کی موجودگی میں کم از کم معاشرہ انتشار سے دوچار نہیں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ امام علیؑ نے اپنے منصوص اور مسلم حقوق کی پامالی کے دوران بھی حاکمان وقت کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ آپؑ کی نگاہ میں معاشرے میں ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے، مشکل وقت میں معاشرے اور دین کو نقصان سے بچانے کے لئےان سے تعاون اور ہمکاری کرنا ایک معقول اور دانشمندانہ عمل ہے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر کے دور خلافت میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ قادسیہ وقوع پذیر ہوئی تو آپؑ نے خلیفہ دوم کو مفید اور کارآمد مشوروں سے نوازا اور اس ضمن میں فرمایا:

''امور (سلطنت) میں حاکم کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو مہروں میں ڈور ے کی جو انہیں سمیٹ کر رکھتا ہے۔ جب دورا ٹوٹ جائے تو سب مہرے بکھر جائیں گے اور پھر کبھی سمٹ نہ سکیں گے آج عرب والے اگرچہ گنتی میں کم ہیں مگر اسلام کی وجہ سے وہ بہت ہیں اور اتحاد باہمی کے سبب سے (فتح) و غلبہ پانے والے ہیں تم اپنے مقام پر کھوٹی کی طرح جمے رہو اور عرب کا نظم ونسق برقرار رکھو اور ان ہی کو جنگ کی آگ کا مقابلہ کرنے دو۔'' (16)

اسی تناظر میں ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ سے زیادہ کوئی شخص بھی امت محمدﷺ کی جماعت بندی اور اتحاد باہمی کا خواہشمند نہیں ہے جس سے میری غرض صرف حسن ثواب اور آخرت کی سرفرازی ہے۔ میں نے جو عہد کیا ہے اسے پورا کرکے رہوں گا۔''(17)

## تفرقہ بازی سے اجتناب

ہر چیز کے کچھ آفات ہوا کرتی ہے اسی طرح محبت اور انس کے لئے بھی کچھ آفات ہیں جن سے اجتناب کرنا ضرور ی ہے۔ تفرقہ بھی ایک ایسی آفت اور وبا ہے جس سے معاشرے میں انتشار اور دشمنیاں جنم لیتی ہیں۔ جب ہم گزشتہ اقوام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تفرقہ انگیز ی کی وجہ سے وہ انتشار سے دوچار رہے۔ بنابر ایں امامؑ بھی اس بات کی تاکید فرما

رہے ہیں کہ گزشتہ اقوام سے درس لینے کی ضرورت ہے جو قوم ان چیزوں سے اجتناب کرتی ہے وہ وحدت اور یکجہتی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہے۔اسی ضمن میں آپؑ نے فرمایا:

"جو تم سے پہلی امتوں پر ان کے بد اعمالیوں اور بد کردایوں کی وجہ سے نازل ہوئے اور اپنے اچھے اور برے حالات میں ان کے احوال و واردات کو پیش نظر رکھو اور اس امر سے خائف و ترساں رہو کہ کہیں تم بھی انہی کے ایسے نہ ہوجاو۔ اگر تم نے ان کی دونوں (اچھی، بری) حالتوں پر غور کر لیا تو پھر ہر اس چیز کی پابندی کرو کہ جس کی وجہ سے عزت و برتری نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا اور دشمن ان سے دور دور رہے اور عیش و سکون کے دامن ان پر پھیل گئے اور نعمتیں سرنگوں ہو کر ان کے ساتھ ہو لیں اور عزت و سرفرازی نے اپنے بندھن ان سے جوڑ لیے (وہ کیا چیزیں تھیں؟) یہ کہ افتراق سے بچے اور اتفاق و یکجہتی پر قائم رہے۔ اسی پر ایک دوسرے کو ابھارتے تھے اور اسی کی باہم سفارش کرتے تھے اور تم ہر اس امر سے بچے رہو جس نے ان کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ ڈالا اور قوت و توانائی کو ضعف سے بدل دیا۔" (18)

اسی ضمن میں امام علیؑ نے تفرقہ انگیزی کی وجوہات کو بھی مورد بحث قرار دیا ہے اگرچہ معاشرتی، سیاسی،مذہبی اورذاتی مفادات کی شکل میں میں مختلف قسم کی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر امامؑ نے پہلی چیز جس کی وجہ سے معاشرے میں لوگوں کے درمیان انتشار، تفرقہ اور بدگمانیاں پھیل جاتی ہیں اسے خبث باطنی اور سوء فکر قرار دیا ہے جنہیں شیطان مختلف اوقات میں اپنے مطیع بندوں کے دلوں پہ القا کرتا ہے۔

امام علیؑ کی نگاہ میں تمام نسلی اور قومی اختلافات کی وجہ شیطان کی پیروی اور اس کے مکرو فریب سے غافل رہنا ہے جس کی پکڑ میں آکے معاشرے میں بہت سے افراد اس قسم کے اختلافات کو ہوا دیتے ہیں اسی لیے کئی موارد میں امامؑ نے لوگوں کو شیطان سے چوکنا رہنے کی تاکید کی ہے۔

## اتحاد کے فوائد

قدیم الایام سے موجودہ دور تک معاشرے میں عموماً بہت سے لوگ معرفت سے عاری ہونے کی وجہ سے اہم ترین مسائل اور موضوعات کی افادیت سے چشم پوشی کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے

اسلام میں معرفت حاصل کرنے کی بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے خدا کی معرفت، نفس کی معرفت، دین کی معرفت، رہبر وامام کی معرفت۔۔۔غرض گوناگوں معاملات وموضوعات ہیں جن کی معرفت سے ہی انسان ان کی افادیت کو سمجھ سکتا ہے۔ صدر اسلام سے عہد حاضر تک مسلمانوں کے لیے اتحاد امت اہم موضوعات میں سے رہا ہے تاریخی حقائق بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ مسلمان جب تک متحد رہے ہیں ان کی طاقت اور عظمت پوری دنیا کے سامنے نمایاں رہی ہے۔ اسی لیے امامؒ نے کئی موارد میں اپنی رعایا کی اس لیے مذمت کی ہے کہ ان میں اتحاد کا فقدان رہاہے اور وہ اس کی افادیت اور تفرقے کے نقصانات سے نا آشناہیں۔ امام کئی مواقع پر اتحاد کی افادیت سے لوگوں کو روشناس کراتے رہے ہیں تاکہ لوگوں میں اتحاد کے حوالے سے معرفت جنم لے۔ اس ضمن میں امامؒ نے نعمتوں کی فراوانی اور مادی و معنوی آسودگی کو اتحاد کے فوائد میں سے شمار کیا۔امام کی نظر میں اتحاد کی نعمت اتنی اہم ہے کہ اگر باطل پر اکڑنے والے بھی اپنے باطل پر متحد رہیں تو اس کے فائدے سےوہ بھی بہرہ مند ہونگے۔ اس تناظر میں امامؒ نے پیغمبرﷺ اسلام کی بعثت کے بعد اتحاد اور ہم بستگی کے سایہ میں مسلمانوں کو حاصل مادی اور معنوی نعمات الٰہی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"دیکھو اللہ نے ان پر کتنے احسانات کیے کہ ان میں اپنا رسول بھیجا کہ جس نے اپنی اطاعت کا انہیں پابند بنایا اور انہیں ایک مرکز وحدت پر جمع کر دیا اور کیونکہ خوش حالی نے اپنے پروبال ان پر پھیلادیئے اور ان کے لیے بخشش وفیضان کی نہریں بہادیں اور شریعت نے انہیں اپنی برکت کے لیے بے بہا فائدوں میں لپیٹ لیا۔"(19)

اسی طرح امامؒ نے ایک اور موقع پر اتحاد کو نصرت الٰہی اور امداد حق کا موجب سمجھا ہے۔آپ نے خوارج کو شرپسندی چھوڑنے اور مسلمانوں کے پرامن طبقے کی صف میں شامل ہونے کی نصیحت کے دوران فرمایا:

"تم اسی راہ پر جمے رہو اور اسی بڑے گروہ کے ساتھ لگ جاؤ چونکہ اللہ کا ہاتھ اتفاق واتحاد رکھنے والوں پر ہےاور تفرقہ و انتشار سے باز آجاؤ اس لیے کہ جماعت سے الگ ہو جانے والا شیطان کے حصہ میں چلا جاتا ہے۔"(20)

اسی طرح امام نے متحد رہنے والوں کو فتح وکامرانی کی نوید سنائی ہے چاہے وہ باطل پر ہی کیوں نہ ہو اسی حوالے سے آپ نے کوفیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ قوم (اہل شام) تم پر غالب آکر رہے گی اس لیے نہیں کہ ان کا حق تم سے فایق ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے ساتھی کی طرف باطل پر ہونے کے باوجود لپکتے ہیں تم میرے حق پر ہونے کے باوجود سستی کرتے ہو۔" (21)

اسی طرح امامؑ نے اتحاد کے فوائد کو ذکر کرتے ہوئے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ متحد قومیں تاریخ میں فاتح، مستحکم اور صاحب اقتدار وعظمت رہی ہیں یہ سنت ابتدائے آفرینش انسان سے جاری رہی ہے اس کی زندہ مثال ظہور اسلام کے بعد ہمارے سامنے آئی۔ ایک بکھری ہوئی قوم کو پیغمبرﷺ نے جس طرح متحد کرکے دنیا کی باعزت اور طاقتور قوم کی شکل میں تبدیل کیاوہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل ہے۔ امام جس طرح اپنی رعایا اور قوم کی نااتفاقی کا رونا رو رہے تھے وہی صورتحال بلکہ اگر مبالغہ نہ ہوتو اس سے حد درجہ بدتر صورتحال سے آج کے مسلمان کی ہے۔ ایک طرف آپس کی نااتفاقی دوسری طرف طاغوت کی یلغار، اسی طرح خوارج صفت عناصر کا ظہور ایک طرف تو دوسری طرف مذہبی عصبیت کی گھناونی شکل نے مسلمانوں کو ناگفتہ بہ صورتحال سے دوچار کیا ہے۔

"غور کرو کہ جب ان کی جمعیتیں یک جا ،خیالات یکسو اور دل یکساں تھے اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور تلواریں ایک دوسرے کی معین و مدد گار تھیں اور ان کی بصیرتیں تیز اور ارادے متحد تھے، تو اس وقت ان کا عالم کیا تھا کیا وہ اطراف زمین فرمانروا اور دنیا والوں کی گردنوں پر حکمران نہ تھے؟ اور تصویر کا یہ رخ بھی دیکھو کہ جب ان میں پھوٹ پڑ گئی، یکجہتی درہم و برہم ہو گئی، ان کی باتوں اور دلوں میں اختلافات کے شاخسانے پھوٹ نکلے اور وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور الگ جتھے بن کر ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے، تو ان کی نوبت یہ ہو گئی کہ اللہ نے ان سے عزت و بزرگی کا پیراہن اتار لیا اور نعمتوں کی آسائشیں ان سے چھین لیں اور تمہارے

درمیان ان کے واقعات کی حکایتیں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت بن گئی۔" (22)

اسی خطبے میں ہی امامؑ مسلمانوں کو اسلام کے سائے میں وحدت کے ساتھ زندگی گزارنے کے نتیجے میں جو نعمتیں عطا کی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے صدر اسلام کے، مسلمانوں کی عزت، شان و شوکت اور سربلندی کا خاص حوالہ دے رہے ہیں۔اسی تناظر میں امام نے فرمایا:

" (اسلام کی وجہ سے ان کی وحدت کے ساتھ جو زندگی تھی اس)کے تمام شعبے (نظم وترتیب سے) قائم ہو گئے اور ان کے حالات (کی درستگی) نے انہیں غلبہ و بزرگی کے پہلو میں جگہ دی اور ایک مضبوط سلطنت کی سربلند چوٹیوں میں (دین و دنیا کی) سعادتیں ان پر جھک پڑیں وہ تمام جہان پر حکمران اور زمین کی پہنائیوں میں تخت و تاج کے مالک بن گئے اور جن پابندیوں کی بنا پر دوسروں کے زیر دست تھے۔اب یہ انہیں پابند بنا کر ان پر مسلط ہو گئے اور جن کے زیر فرمان تھے ان کے فرمانروا بن گئے۔ نہ ان کا دم خم ہی نکالا جاسکتا ہے اور نہ ان کا کس بل توڑا جا سکتا ہے۔" (23)

امامؑ کے ان فرامین سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کی عزت اور شان و شوکت وحدت اسلامی کے سائے میں ہی ممکن ہے۔ جس طرح رسول گرامی اسلامﷺ کی حیات طیبہ میں مسلمانوں کو اللہ نے اپنی الطاف خاص کا مستحق ٹھہرا کے دنیا کے سامنے سربلند کیا اور انہیں اجتماعی، سیاسی اور مذہبی طاغوتوں پر غلبہ عطا کیا آج بھی یہ سنت الٰہی مسلمانوں کے لیے میسر ہے۔ اگر موجودہ دور میں مسلمان دوبارہ اسلام کی حیات بخش تعلیمات کی روشنی میں اپنی روش اور طریقہ زندگی کو بدلنے کا مصمم ارادہ کر لیں تو خدا بھی ان کی حالت کو تبدیل کرے گا یہ خدا کا وعدہ بھی ہے۔ مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ اپنی کمزوریوں پر غور کیے بغیر دوسروں کو ہی قصوروار ٹھہرانے کی وجہ سے ان میں سوچنے، سمجھنے اور مسائل کا حل نکالنے کی ختم ہوگئی ہے۔ اگر مسلمان آج استعماری طاقتوں کی سیاسی، اقتصادی اور ریاستی دہشتگردی کی زد میں ہیں تو اس کے مقابلے میں متحد ہو کے ایک پالیسی اپنانے سے انہیں کس نے روکا ہے؟۔ بنابرایں امامؑ،

اُمت کو اس اہم خدائی نعمت کی جانب متوجہ کر رہے ہیں کہ اگر دوبارہ اپنی عظمت رفتہ کی بازگشت چاہتے ہو تو لازمی طور پر اسلامی تعلیمات کے زیر سایہ متحد ہونا ہوگا۔

## تفرقہ کے نقصانات

موجودہ دور میں مختلف ادیان کے پیروکاروں کے درمیان بدگمانی، شدید عداوت اور دشمنی پائی جاتی ہے۔ ہر دین کے پیروکار دوسرے دین کو باطل اور ان کے پیروکاروں کو کافر جہنمی اور مبغوض خدا سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ محبت حرام اور اسے ایمان کی کمزوری کی نشانی قرار دیتے ہیں۔ تمام ممکنہ ذرائع و وسائل سے دوسرے ادیان کی تخریب اور ان کے پیروکارون کو فاسد کرنے میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر اپنے جاسوس اور ایجنٹوں کے ذریعے فتنہ و فساد اور اختلافات کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ بنابرایں اس قسم کے عناصر سے مسلمانوں کو ہمہ جہت اور ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی باہمی دشمنی اور ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑوں اور اختلافات سے اسلام دشمن خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پوری تاریخ پر محیط مسلمانوں کے مذہبی فسادات اور اختلافات میں کوئی فریق نابود نہیں ہوا۔ البتہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اختلافات کے نتیجے میں مسلمانوں اور اسلامی معاشرے کا بہت نقصان ہوا ہے نیز مسلمانوں کی تہذیبی، ثقافتی، سائنسی اور صنعتی ترقی کو بڑا ضرر پہنچا ہے۔ اس قسم کے ناقابل جبران نقصانات کو سامنے رکھتے ہوئے امامؑ نے اتحاد کے فوائد کے ساتھ تفرقہ کے نقصانات کو بھی بیان کیا ہے اور تفرقہ کو نعمات الٰہی اور عزت و کرامت کے چھن جانے کا سبب قرار دیا ہے اس ضمن میں فرمایا ہے:

> ”جب ان میں پھوٹ پڑ گئی یکجہتی درہم برہم ہوگئی، ان کی باتوں اور دلوں میں اختلافات کے شاخسانے پھوٹ نکلے، اور وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور ایک الگ جتھے بن کر ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے، تو ان کی نوبت یہ ہو گئی کہ اللہ نے ان سے عزت و بزرگی کا پیراہن اتار لیا اور نعمتوں کی اسائشیں ان سے چھین لیں اور تمہارے درمیان ان کے واقعات کی حکایتیں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت بن کر رہ گئے۔“(24)

امامؑ اختلافات کے عواقب اور نقصانات کے ضمن میں صدر اسلام کے ان ناخوشگوار حالات کا حوالہ دے رہے ہیں جہاں امامؑ کے بقول بہت سے لوگ وفات رسول اکرمﷺ کے بعد آپس کی نااتفاقی کی بدولت ہدایت سے ہاتھ کھینچ رہے تھے۔ اس دور کے حالات کو امامؑ ان الفاظ میں بیان کر رہے تھے:

"وہ لوگ گمراہی کے راستوں پر لگ کر اور ہدایت کی راہوں کو چھوڑ کر (افراط و تفریط) کے دائیں بائیں راستوں پر ہو لیے ہیں جو بات کہ ہو کر رہنے والی اور محل انتظار میں ہو اس کے لیے جلد ی نہ مچاؤ۔"(25)

اس کے علاوہ امامؑ کوفیوں میں سے ایک گروہ کی تفرقہ انگیزی کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی مذمت کر رہے ہیں اور انہیں ہدایت سے نکلے ہوئے لوگوں کے طور پر متعارف کرا رہے ہیں چونکہ وہ نہروان کی جنگ سے پہلے کوفہ میں اختلافات اوربغاوت کو ہوا دے کر سپاہ خوارج سے پیوستہ ہو گئے تھے۔ امامؑ ان لوگوں کے بارے میں فرما رہے ہیں:

"آج تو شیطان نے انہیں تتر بتر کر دیا ہے اور کل ان سے اظہار بیزاری کرتا ہوا ان سے الگ ہو جائے گا ان کا ہدایت سے نکل جانا، گمراہی وضلالت میں جانا پر ناحق سے منہ پھیر لینا اور ضلالتوں میں منہ زوریاں دکھانا ہی ان کے (مستحق عذاب) ہونے کے لئے کافی ہے۔"(26)

اس کے علاوہ امام کی نگاہ میں تفرقہ اور اختلافات شکست ناقابل جبران کا باعث بنتی ہے اسی لیے ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ شکست کسی خاص معاملے تک محدود نہیں یہ ہمہ جانب اور ہمہ گیر ہوسکتی ہے اگرچہ امامؑ جنگی شکست کا تذکرہ کر رہے ہیں مگر اس کے عواقب کو دقت کے ساتھ دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس معاملے میں بھی اختلافات نمایاں ہوں وہاں شکست یقینی ہے۔ امام کوفیوں کو تفرقہ انگیزی کے ضمن میں فرما رہے ہیں:

"تمہاری مثال تو ان اونٹوں کی سی ہے جن کے چرواہے گم ہو گئے ہوں اگر انہیں ایک طرف سے سمیٹا جائے تو دوسری طرف سے تتر بتر ہو جائیں گے۔ خدا کی قسم تم جنگ کے شعلے بھڑکانے کے لیے بہت برے ثابت ہوئے ہو تمہارے خلاف سب تدبیریں ہوا

کرتی ہیں اور تم دشمنوں کے خلاف کوئی تدبیر نہیں کرتے تمہارے شہروں کے حدود (دن بہ دن) کم ہوتے جا رہے ہیں مگر تمہیں غصہ نہیں آتا وہ تمہاری طرف سے کبھی غافل نہیں ہوتے اور تم ہو کہ غفلت میں سب کچھ بھولے ہوئے ہو۔ خدا کی قسم ایک دوسرے پر ٹالنے والے ہارا ہی کرتے ہیں، خدا کی قسم میں تمہارے متعلق یہی گمان رکھتا ہوں کہ اگر جنگ زور پکڑلے اور موت کی گرم بازاری ہو تو تم علی ابن ابی طالبؑ سے اس طرح کٹ جاوگے جس طرح بدن سے سر۔" (27)

بہرحال امامؑ کے ان نورانی فرامین سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قوموں کی عزت و شرافت اتحاد میں مضمر ہے امام اگرچہ اپنی رعایا کی مذمت کرتے ہیں اور انہیں اپنے اختلافات کو بھلا کے اتحاد کی دعوت دے رہے ہیں مگر امام کی یہ ندا اس دور سے زیادہ آج کے مسلمانوں کے لیے شفا بخش دوا کی حیثیت سے کم نہیں۔اس وقت کے مسلمان اندرونی اختلافات کا شکار تھے جبکہ آج کے مسلمان اندرونی اختلافات کی بھیانک شکل سے دوچار ہیں اور بیرونی محازوں پہ دشمن ہر گزرتے لمحے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کر رہا ہے ایسے کھٹن لمحے میں اسلام کے ان عظیم رہبروں کی ہدایت بخش تعلیمات کو مشعل راہ قرار دے کر امت کی رہنمائی کے لیے ان کو عملی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے درمیان اختلافات متنوع اور مختلف ہونے کے ساتھ نہایت پیچیدہ بھی ہیں۔ یہ اختلافات خود بخود ختم ہونے والے نہیں۔ اگر امت اسلامی کا درد اور دینی غیرت رکھنے والے ہوشیاری اور تدبر کے ساتھ روکنے کی کوشش کریں تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس میں کمی آجائے اور اس کے برے اثرات کم ہو جائیں۔ یہ کوشش امت محمدیہ اور اسلای دنیا کی سب سے بڑی خدمت ہو گی یہی امام علی علیہ السلام کی خواہش بھی ہے اور ان کی سیرت بھی۔

*****

# حوالہ جات


1۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۹۰،ص ۵۳۱،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
2۔ایضاً
3۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)مکتوب ۶۲،ص ۷۸۰،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
4۔ایضاً
5۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ،۱۸،ص ۱۳۳،امامیہ کتب خانہ لاہور۔
6۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)مکتوب،۵۸،ص ۷۷۶،امامیہ کتب خانہ ،لاہور۔
7۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)مکتوب،۴۷،ص ۷۹۹،امامیہ کتب خانہ ،لاہور۔
8۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۲۳،ص ۳۵۰،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
9۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۲۵،ص ۳۵۴،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
10۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ،۱ ص۷۶،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
11۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۳۳،ص ۱۷۱،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
12۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۹۳ ص ۲۸۴،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
13۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۹۴ ص ۲۸۵،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
14۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۲۱۴ ،ص۵۹۲،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
15۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ، ۲۱۳،ص ۵۹۲،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
16۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۴۴،ص ۳۸۴،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
17۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)مکتوب ۷۸،ص ۸۰۲،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
18۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۹۰،ص۵۲۷،،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
19۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین) خطبہ ۱۹۰،ص ۵۳۰،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
20۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)خ،۱۲۵،ص ۳۵۲،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
21۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)خ ۹۵، ص ۲۸۴،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
22۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)خ ۱۹۰،ص ۵۲۸،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
23۔ایضاً
24۔ایضاً ص ۵۲۹

25۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)خ،۱۴۸ ص ۳۹۲،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
26۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)خ ۱۷۹ ص ۴۷۱،امامیہ کتب خانہ ، لاہور۔
27۔سید رضی، نہج البلاغہ (ترجمہ مفتی جعفر حسین)خ ۳۴،ص ۱۷۲،امامیہ کتب خانہ، لاہور۔

# *THE ROLE OF KUFAN LETTERS IN THE UPRISING OF IMAM HUSSAIN (A.S)*

By: ***Dr. Abbas Haider Zaidi*** [*]
abbaspsc@yahoo.com

***Key Words:****Kofun (people of Kofa), Muslim bin Aqeel, Solaiman bin Surad, Umayyad, Obaidullah bin Ziyad.*

***Abstract:***

*It is a common perception that Imam Hussain decided to rise up against Yazid due to the Kufan letters. The people of Kofa, however, betrayed the imam and he was killed due to his own Shias i.e. followers. This article will examine those letters, available in history, in the context of that particular era to highloight the reality. According to Maqtal-e- Lahoof, the Kufan started looking at the imam when they knew about the arrival of imam in Mecca and his refusal to allegiance to pledge allegiance to Yazid. On the other sides, the sympthazers of Yazid in Kofa also wrote letters to Yazid, telling him about the situation in Kofa, which propelled Yazid to appoint Ibn-e-Ziyad as new governor to crush the movement of imam and kill him. It is, therefore, not true to say that Imam Hussain (a.s) decided to go kofa to take over the government and then fight against Yazid due to the invitation he received from Kofans.*

abbaspsc@yahoo.com

*.

# *THE VICEGERENCY OF IMAM SADIQ (A.S)*

*By:* ***Dr. Sajjad Ali Astori****
*drastori@yahoo.com*

***Key Words****: Nazzariyah, Mostaa'liyah, Ismaeiliyah, Nas, Bohari, Druze, Qaramitah, Khalisah, Mubarakiyyah, Shamtiyyah.*

***Abstract:***

*Imam Sadiq is the 6th and 5th imam of Shias and Ismaeilis, respectively. The period of his Imamat is approximately thirty years. After his martyrdom, his followers divide into two main sects viz. Twelver Shiism and Ismailiyah. According to the Twelver Shias, he appointed his son Mosa Kazim as his successor. According to Al Qummi and Al Nobakhti, this sect was called Qat'iyyah for a period of time, following the martyerdom of the imam, due to their firm belief (qat'a/ surety) in the death of Ismael. Later on, they became well known as the Twelver Shias because of their faith in twelve imam. In contrast to Twelver Shias, the Ismaeilis are of the view that imam Sadiq had nominated Hazrat Ismael as his successor. Due to the restraints imposed by the Abbasside rulers on imam Sadiq, the declaration of his vicegerency had to be kept secretive and not to make public. This created ambiguities and obscurities regarding the successor. According to some ancient historians, soon after the martyrdom of imam Sadiq, four sects emerged each following a son of the imam. The followers of Abdullah Aftah bin Jafar became called as Aftahiyyah that later accepted imam Mosa kazim as thgeir Imam. The followers of Muhammad Al Debaj bin Jafar also accepted the imamate of imam kazim, later. The followers of Ismael, however, continued to exist. Yet, the followers of imam Kazim form the second largest sect of Islam.*

*.

# *THE CAUSES OF THE UPRISING OF HAZRAT ZAID, THE MARTYR (AN ANALYTICAL REVIEW)*

*By:* ***Dr. Syed Haider Abbas Wasti****
*dr.sha.wasti@gmail.com*

***Key Words:*** *Hajjaj bin Yousuf, Khalid Qusri, Hashsham bin Abd al Malik, the incident of Karbala, Umayyad, Hashemite.*

***Abstract:***

*The Umayyad era is known as 'black era' in the history because of the Umayyad's wickedness, cruelty and injustice. To hide this, they launched baseless propaganda campaign against the movements that rose up against them in order to make them hateful for coming generations. After the incident of Karbala, the next remarkable resistance from Hashemite against Umayyad rule is known as the uprising of Zaid, the martyr. In this article, an analytical review of the uprising of Hazrat Zaid has been presented. The reasons that pushed Hazrat Zaid to rise up against the Umayyad ruler, Hashsham bin Abd al Malik, instead of having less active supporters, have also being looked over. The uprising of Zaid Shaheed awakened the populace and gave courage to the forthcoming anti-Umayyad movements which resulted in the ouster of Umayyad dynasty. The Umayyad rulers formulated Ahadith against jihad to keep Hashemite away from uprisings that created doubts about the uprising of Zaid Shaheed. The lengthiest Hadith of this kind has been mentioned here from Osool al Kafi of Sheikh Kolaini. Zaid Shaheed neither went against the directives of Imam Muhammad Baqir and Imam Jafar Sadiq nor claimed to be an imam, rather it was a propaganda launched by the Umayyad rulers in a bid to keep people away from him. Zaid Shaheed had got permission of uprising from imam Sadiq secretly.*

*.

# *THE NECESSITY OF HUMAN SOCIALIZATION (IN THE LIGHT OF THE THOUGHTS OF IMAM KHOMEINI)*

*By :**Syed Rameez -ul- Hassan Mosavi**[*]*
*srhm2000@yahoo.com*

***Key Words**: Socialization (tarbi'at), Prophets, Childhood, Human nature*

***Abstract:***

*Mankind is the only creature that is equipped with divine characteristics and qualities. Without a proper training and socialization, these qualities could not be mastered. Human beings, therefore, need socialization. By need we mean something without which nothing can reach to its perfection. The necessity of socialization is stressed by both Quran and Hadith (Tradition). Imam Khomeini also has underscored the importance of socialization in his writings and speeches. In many points, he has emphasized the necessity of socialization and piety to flourish and expose the hidden qualities of human beings while warning about the destruction the absence of these two things must cause. According to Imam Khomeini, human beings need socialization from their childhood to old age. For him, all the prophets have been sent to socialize human beings. To reach to perfection, it is essential for humans to follow the prophets and to keep themselves under their guidance.*

*. Editor Quartely Noor-e-Marfat; NMT; Bara Khau, Islamabad.

# *THE BEGINNING AND EVOLUTION OF MEANS OF COMMUNICATION AND ITS CONTEMPORARY SIGNIFICANCE (AN ANALYTICAL STUDY)*

*By:* ***Dr. Muhammad Riaz*** [*]
dr.riazrazee@gmail.com

***Key Words****: Means of communication, Contemporary significance, Beginning and evolution, Human labor, 21 century, Communicative approaches.*

***Abstract:***

*The invention of means of communication is a marvelous result of the continuity of human labor and necessity. Although the birth of means of communication dates back to the very early human life, the modern form of it emerged in 21 century. As in other fields of life, the element of modernity is prominent in approaches of the means of communication as well. The scope of primitive communication was limited both in nature and practice. Family, tribe, clan, villagers were accounted as listeners, observers and viewers. Communicative approaches included signs, symbols, statues, discussions, gatherings, festivals, writings and speeches. This field was called journalism prior to the early decades of 20th century. Yet, terms, such as Dawa't, Tableegh, Amr bil ma'roof wan ahi anil munkr, Khotba, were used due to their distinction. By the end of 20th century, electrical appliances enhanced the modernity of means of communication. The electrical appliances not only changed its nature, but also named it as 'means of communication'. In this article, the beginning, evolution and importance of means of communication is discussed in the context of the literal and technical meaning of 'means of communication'.*

*. Research Scholar; Karachi University.

# *THE PLACE OF UNITY IN QURAN AND SUNNAH*

*By:* ***Ghuam Muhammad****
*ghulammuhammadphd@gmail.com*

***Key Words:*** *Unity (among Muslims), Islamic strategy, the responsibility of media, the history of Islam, Tradition, Mutual cooperation.*

***Abstract:***

*Islam is the religion of unity. The basic source of Islam, Quran, attaches great importance to unity. According to it, unity among Muslims is not only a strategy, it is also a religious duty and one of the main goals of Islam. History shows that no one could stand against Muslims when they remained united. Disunity and sectarianism is disliked by Allah and His Holy Prophet. Unity does not mean adopting one sect from many sects of Islam, rather it is to unite with diversity of sects against the enemies of Islam. At the end of the article, some suggestions have also been given. According to the suggestions the literature that entice hatred must be banned; the tradition of declaring others as infidel, apostate, or worthy-to-be-killed on the basis of sects must be renounced; the perpetrators of sectarian killings must not be spared; the Qur'anic verses regarding the prohibition of killing and murdering must be propagated in society; both the electronic and print media must work more for unity and avoid those things that may cause disunity and disharmony*.

*. Research Scholars at KU, Dep of Islamic Sciences; Karachi

# *DIFFERENT THEORIES ABOUT THE CONCEPT OF RELIGION*

*By:* ***Hina Khorasani Rizvi****
*hinakhorasanyrizvi@yahoo.com*

***Key*** *words: Spiritualism, Animism, Idolatry, Monotheism.*

***Abstract***

*What is religion? How long is the period of human attachment with it? Was is part of human conscience from the very beginning or humans got acquainted with it with the passage of time, after settling in the earth? Such questions and issues have always been debated, from the gatherings of ancient philosophers and thinkers to that of the scientist of the modern technological era. In fact, every on has tried, in his or her own way, to unveil the secrets of the reality of religion. Today, many puzzle appear to be solved that were considered to be mysterious and supra-intellectual. Sun and moon, for instance, were worshiped as gods in many ancient nations. Sun and moon were asked to fulfill their desire different efforts were put to please them. Their annoyance was considered as a cause of fear as well as destruction and ruination. As against them, today we know that sun and moon are neither gods nor have any divine powers, they are rather a very little part of the vast universe*.

*.

# *DIFFERENT THEORIES ABOUT THE CONCEPT OF RELIGION*

*By:* ***Amal Mosavi****
*Afm.pk.2013@gmail.com*

***Key*** *words: The Sunnah of Allah, demise, Demised nations, Cruelty and turbulence.*

*A**bstract***

*The most important factor in the rise and fall of nations is the causes that influence the former. Death and demise is everyone's destiny. The demise or fall of societies is not like the death of individual human beings. The demise of societies always bear some causes and factors. A study of Quran reveals that those nation sand societies have been eliminated from the face of earth which disobeyed the divine rules and were egoistic and egomaniac. The study of such nations points out the fact that injustice and cruelty was common among its members. Injustice was not done just to others, it was extended towards Allah and themselves also. Injustice to Allah is polytheism which was common in them. Instead of the*

*continuous guidance from prophets, they remained stick to infidelity an polytheism. The injustice to Allah is the beginning and base of all other injustice. To safe the current societies from demise and destruction, it is imperative to study the previously demised nation and to lean*.

*.

# *THE NECESSITY AND SIGNIFICANCE OF UNITY IN THE VIEW OF IMAM ALI (A.S) (IN THE CONTEXT OF NAHJ-AL-BALAGHAH)*

*By:* ***Dr. Muhammad Afzal****
*dr.muhammadafzalkarimi@gmail.com*

***Key*** *words: Islamic unity, the Tradition of the Holy Prophet (PBUH), Kofans, Kharijiite muslim society.*

***Abstract***

*The necessity and significance of unity was obvious from the beginning. The Holy Prophet (PBUH) practically highlighted the necessity and significance of unity in his life. He established an Islamic brotherhood through 'Mawakh'at' from the very beginning of the formation of the Islamic state. The difference between Shia and Sunni Muslims is not just that of jurisprudential and peripheral, there are differences in belief system as well. Instead of the existence of differences, the people of two sects live side by side as brothers. The intellectual and academic difference is not a curse. We can observe people of different ideological backgrounds living together in a single country and city. If unity is achieved in material affairs, it is also achievable in common life as well. Imam Ali (a.s) has practically maintained unity and has in many occasions discussed the necessity and importance of unity, while throwing light on the disasters of disunity. Syed Razi ha complied the sermons, letters and quotations of Imam Ali (a.s) in the name of NAhaj-al-Balaghah that has been here as an intellectual asset for centuries. The words of Imam reveal the fact that the dignity and respect of nations is attached with unity. Differences do not evaporate by themselves, it necessitate careful and vigilant efforts of those who have the whim and wish for Islamic unity. Such an attempt would be a great service for both the Islamic community and Muslim world, and it is also the desire and tradition of Imam Ali (a.s).*

*. Research Scholar, Karachi University.

سہ ماہی **نور معرفت**

ممبر شپ فارم

نام: _____ تعلیم: _____

پیشہ: _____ فون نمبر: _____

پتہ: _____

_____

E-mail: _____

براہ کرم سال _____ کے لئے نور معرفت میرے نام جاری کر دیجئے۔ شکریہ دستخط خریدار: _____

---

## دفتری استعمال کے لئے

برادر/خواہر _____ کی ممبر شپ برائے سال _____ کی درخواست منظور کرتے ہوئے رجسٹریشن نمبر جاری کر دیا گیا ہے متعلقہ ممبر کو مجلّہ باقاعدگی سے ارسال کیا جائے گا۔

رجسٹریشن نمبر: _____ تاریخ اجراء: _____ ممبر ساز: _____

نوٹ: مجلّہ کا 2015ء کے لئے زرِ سالانہ مبلغ:/500 روپے اور فی شمارہ:/130 روپے ہے۔


خط وکتابت کا پتہ:

سہ ماہی نور معرفت/نوری الہدیٰ مرکز تحقیقات/نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

سادات کالونی/بارہ کہو اسلام آباد/فون: 051-2231937

www.nht.org.pk, www.nmt.org.pk

E-mail:noor.marfat@gmail.com

# رسول اللہ ﷺ کے لئے دعا اور آپؐ کی قربانیوں کا تذکرہ

وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی مَنَّ عَلَيْنَا بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ دُونَ الْأُمَمِ الْمَاضِيَةِ وَ الْقُرُونِ السَّالِفَةِ، بِقُدْرَتِهِ الَّتِي لَا تَعْجِزُ عَنْ شَيْءٍ وَإِنْ عَظُمَ، وَ لَا يَفُوتُهَا شَيْءٌ وَإِنْ لَطُفَ. فَخَتَمَ بِنَا عَلَى جَمِيعِ مَنْ ذَرَأَ، وَ جَعَلَنَا شُهَدَاءَ عَلَى مَنْ جَحَدَ، وَ كَثَّرَنَا بِمَنِّهِ عَلَى مَنْ قَلَّ - اللّٰهُمَّ فَصَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ أَمِينِكَ عَلَى وَحْيِكَ، وَ نَجِيبِكَ مِنْ خَلْقِكَ، وَ صَفِيِّكَ مِنْ عِبَادِكَ، إِمَامِ الرَّحْمَةِ، وَ قَائِدِ الْخَيْرِ، وَ مِفْتَاحِ الْبَرَكَةِ. كَمَا نَصَبَ لِأَمْرِكَ نَفْسَهُ - وَ عَرَّضَ فِيكَ لِلْمَكْرُوهِ بَدَنَهُ - وَ كَاشَفَ فِي الدُّعَاءِ إِلَيْكَ حَامَّتَهُ - وَ حَارَبَ فِي رِضَاكَ أُسْرَتَهُ وَ قَطَعَ فِي إِحْيَاءِ دِينِكَ رَحِمَهُ وَ أَقْصَى الْأَدْنَيْنَ عَلَى جُحُودِهِمْ وَ قَرَّبَ الْأَقْصَيْنَ عَلَى اسْتِجَابَتِهِمْ لَكَ وَ وَالَى فِيكَ الْأَبْعَدِينَ وَ عَادَى فِيكَ الْأَقْرَبِينَ وَ أَدْأَبَ نَفْسَهُ فِي تَبْلِيغِ رِسَالَتِكَ.

یعنی: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ہم پر وہ احسان فرمایا جو نہ گزشتہ اُمتوں پر کیا اور نہ پہلے لوگوں پر۔ اپنی اس قدرت کی کار فرمائی سے جو کسی شے سے عاجز و درماندہ نہیں ہوتی اگرچہ وہ کتنی ہی بڑی ہو اور کوئی چیز اس کے قبضہ سے نکلنے نہیں پاتی اگرچہ وہ کتنی ہی لطیف و نازک ہو، اس نے اپنے مخلوقات میں ہمیں آخری اُمت قرار دیا اور انکار کرنے والوں پر گواہ بنایا۔ اور اپنے لطف و کرم سے کم تعداد والوں کے مقابلہ میں ہمیں کثرت دی۔ اے اللہ! تو رحمت نازل فرما محمد اور ان کی آل پر جو تیری وحی کے امانتدار تمام مخلوقات میں تیرے برگزیدہ، تیرے بندوں میں پسندیدہ رحمت کے پیشوا، خیر وسعادت کے پیشتر و اور برکت کا سرچشمہ تھے۔ جس طرح انہوں نے تیری شریعت کی خاطر اپنے کو مضبوطی سے جمایا اور تیری راہ میں اپنے جسم کو ہر طرح کے آزار کا نشانہ بنایا اور تیری طرف دعوت دینے کے سلسلہ میں اپنے عزیزوں سے دشمنی کا مظاہرہ کیا، اور تیری رضا کے لیے اپنے قوم قبیلے سے جنگ کی اور تیرے دین کو زندہ کرنے کے لیے سب رشتے ناطے قطع کر لئے۔ نزدیک کے رشتہ داروں کو انکار کی وجہ سے دور کر دیا اور دور والوں کو اقرار کی وجہ سے قریب کیا۔ اور تیری وجہ سے دور والوں سے دوستی اور نزدیک والوں سے دشمنی رکھی اور تیرا پیغام پہنچانے کے لیے تکلیفیں اٹھائیں۔

(صحیفہ سجادیہ کی دوسری دعا سے اقتباس)

DECLARATION NO: 7334 ISSN2221-1659

QUARTERLY

RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

# NOOR-E-MARFAT

مسلمانوں کے درمیان وحدت و یکجہتی کے لئے امام خمینیؒ اور مفتی مصر شیخ محمود شلتوتؒ جیسے رہنماؤں اور دوسرے منادیان وحدت کی مخلصانہ کاوشوں کے باوجود مسلمانوں کی وحدت اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکا۔ مسلمانوں کے درمیان تفرقے اور عدم برداشت کی اس صورت حال کے اسباب سے تقریبا پوری دنیائے اسلام آگاہ ہے اور میڈیا کے اس دور میں ان اسباب کو چھپانا بہت مشکل ہے۔ لیکن ایمان کی کمزوری اور دنیا پرستی نے مسلمان حکمرانوں سے ان تفرقہ انگیز علل واسباب کو ختم کرنے کی توفیق سلب کردی ہے۔

جہاں سانحہ منیٰ میں سینکڑوں حجاج کے خون پر پردہ ڈالنے کے لئے سرکاری سطح پر اہتمام کیا جائے اور یمن سے لے کر بحرین، عراق، فلسطین اور نائیجیریا کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے امت مسلمہ کے رہنما قرار پائیں اور ساٹھ سال سے قبلہ اول پر قابض ظالم وجابر یہودی حکومت کے تحفظ اور استحکام کے لئے اسلامی جہاد کے نام پر سامراجی قوتوں کے ہم قدم ہوکر لاکھوں شامی مسلمانوں کا خون بہایا جائے، وہاں وحدت و یکجہتی کی توفیقات سلب ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ جب بھی ظلم وستم کرنے والوں کا ساتھ دیا جائے اور شرک وکفر کے سربراہوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے تو اس وقت مسلمانوں پر تفرقہ اور انتشار کا عذاب ضرور مسلط ہوگا اور ان کی ہوا ہمیشہ اکھڑی رہے گی۔

نمت

نورالہدیٰ مرکز تحقیقات، نورالہدیٰ ٹرسٹ، محلّہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

Ph:051-2231937 www.nmt.org.pk|www.nht.org.pk